ہنگاموں میں زندگی

مشتاق احمد وجدی

ہنگاموں میں زندگی

مشتاق احمد وجدی

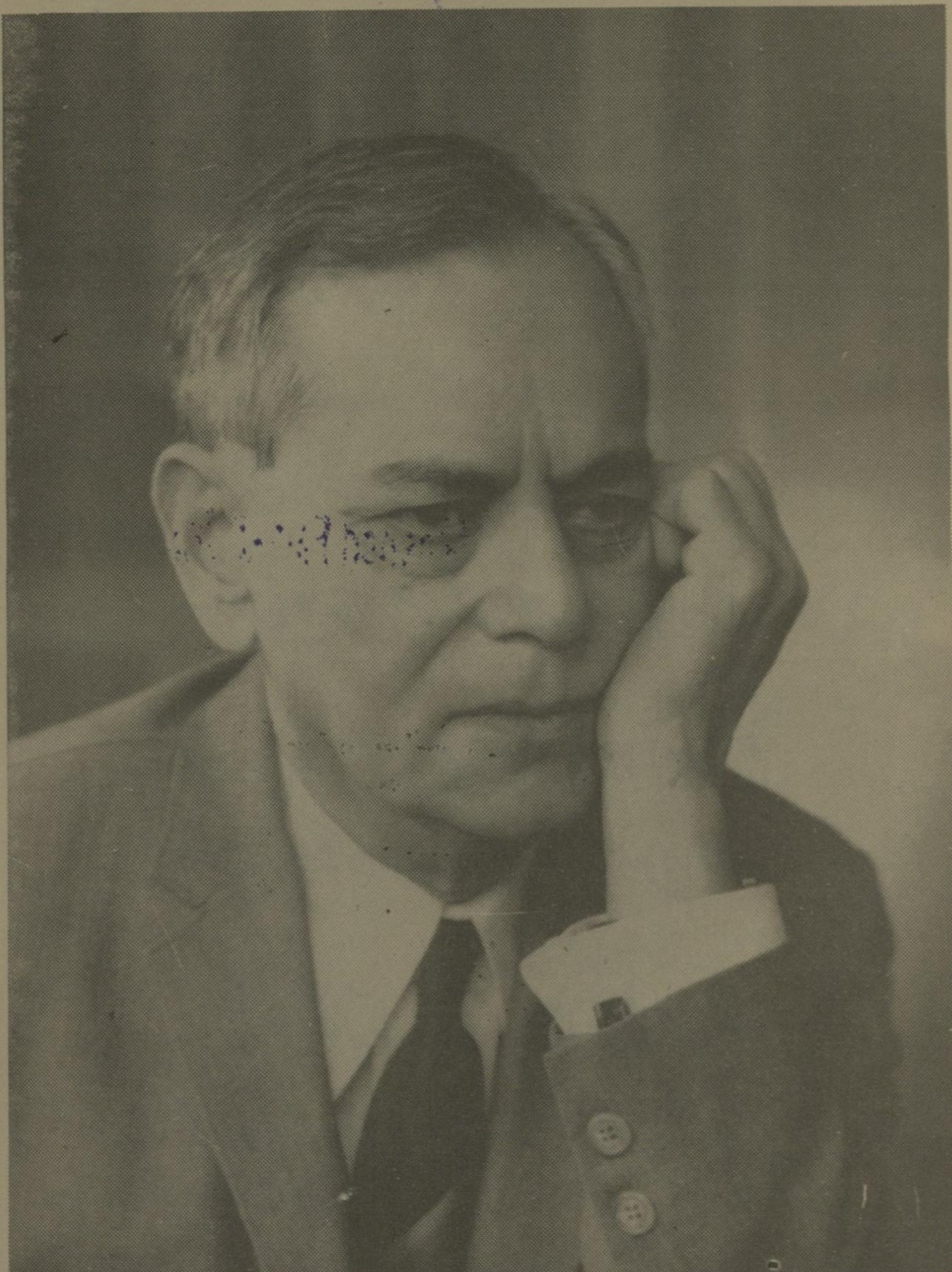
سابق کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل آف پاکستان

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی کراچی

پہلی بار ________ اپریل، ۱۹۷۴ء
تعداد ________ ۱۰۰۰
قیمت ________ بیس رُوپے

مطبوعہ فیروز سنز پریس لاہور باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر پبلشر



شبہائے ہجر را گذراندیم و زندہ ایم
مارا ز سخت جانی خود این گمان نبود

مشتاق احمد وجدی
۲۲ نومبر سنہ ۱۹۷۳ء

منم مرغِ اسیرے مضطرب از بیم جان خود
نہ ذوقِ دانہ دارم نے امید آشیان خود

دل از امید وصل و بیم ہجراں کردہ ام فارغ
نشستہ گوشۂ وارستہ از سود و زیان خود

بباغ روزگار آں خود ستا مُرغ کہن سالم
کہ خود می بینم و خود می سرایم داستان خود

احباب نے کم کیا ہے آنا جانا
میں نے اسے اپنے حق میں اچھّا جانا
تنہائی کی ہو رہی ہے مشق اے امؔن
آخر تو ہے اس جہان سے تنہا جانا

سرکاری ملازمت سے علیحدگی اور سیاست سے کنارہ کشی کے بعد خاموشی کی زندگی گزارتا ہوں۔ بہت کم کوئی آنا جانا ہے۔ لیکن فضلی صاحب لاہور آتے ہیں تو غریب خانہ پر ضرور تشریف لاتے ہیں

اس مرتبہ آئے تو ایک نیا حکم نامہ ساتھ لائے۔ فرمایا کہ اپنی سوانح عمری لکھو عرض کی کہ ویسے تو آپ کے لطف و کرم اور ظلم و ستم کی داستان لکھنے بیٹھوں تو دفتر بھر جائیں لیکن خاکسار کی سوانح حیات کی خوب رہی۔

تھے معزز شخص لیکن لائف ان کی کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

فرمایا کہ تم نے ہنگاموں کے دور میں زندگی بسر کی ہے۔ تمھارے حالات سے مؤرخین کو اس دور کی اہم کڑیاں مل سکتی ہیں۔

تاریخ پر نظر ڈالو تو ہمیشہ ہنگاموں کا دور رہا۔ جو اس دنیا میں پیدا ہوا ہنگاموں میں زندگی بسر کرتا رہا۔ میں نے تو نہ ہنگاموں میں حصہ لیا نہ تاریخی اہمیت کے واقعات پر تنقیدی نظر رکھی کہ میری معلومات مورخوں کے لیے مفید ہوں زندگی

میں کوئی ایسا اہم کردار بھی ادا نہ کیا کہ میرے نقش قدم پر چل کر کوئی خستہ حال اپنی زندگی سنوار سکے۔ لیکن فضلی صاحب کا اصرار اور بے کاری جنوں کو شغل کی تلاش۔ یہ بھی خیال ہوا۔

بدست آور بہ پیری عمر ضائع کردۂ خود را
کہ در شب ہرچہ گم شد روز روشن می تواں جستن

از گریہ خاک را چو چمن می کنیم ما
در غربتیم و سیر وطن می کنیم ما

چند دنوں کی بات ہے کہ سکھر سے لاہور آرہا تھا۔ موٹر کار کا سفر تھا۔ راستہ میں سڑک ٹوٹی ملی۔ معلوم ہوا کہ سولہ میل تک یہی حال ہے۔ شاہراہ مجبوراً چھوڑنی پڑی اور ایک طویل تر چھوٹی سڑک پکڑی۔ کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ ایک آبادی ملی۔ اس کے مکان اونچے مگر کچی اینٹوں کے تھے۔ برسات کا موسم تھا۔ آبادی کے چاروں طرف پانی تھا۔ مکانوں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ کسی نے کہا الہ آباد آگیا۔ دل دھڑکنے لگا بدن میں سنسنی محسوس ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ موٹر روک لی اور دیر تک ان در و دیوار کو دیکھا کیا جو مجموعی طور پر اس غیر مانوس علاقے میں الہ آباد کے نام سے موسوم تھے۔ اس نام کے ساتھ بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ الہ آباد میری جائے پیدائش ہے۔ بہاول پور کا غیر معروف الہ آباد نہیں۔ یوپی کا مشہور و معروف الہ آباد جس کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ جہاں گنگا اور جمنا ملتے ہیں۔ جہاں رام جی نے دریا پار کر کے بن باس شروع کیا تھا۔ جہاں ماگھ میں پانچ چھ لاکھ یاتری جمع ہوتے ہیں تاکہ دو متبرک دریاؤں کے سنگم پر اشنان کر کے نجات دائمی حاصل کریں۔ جو اس گرینڈ ٹرنک روڈ پر آباد ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنگال سے پشاور کو ملانے کے لیے بنایا تھا۔ جہاں خسرو باغ ہے۔ جس کو دیکھ کر اس مغل شہزادے کی دردناک کہانی یاد آتی ہے جو اندھا ہو کر یہاں قید رہا۔ جہاں جمنا برج ہے جس

کی تعمیر کے سلسلے میں حضرت اکبر آٹھ روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ جہاں سنگِ سرخ کا قلعہ ہے جس میں شہنشاہ اشوک کی لاٹ نصب ہے۔ اور جس نے سینکڑوں انقلاب دیکھے ہیں۔

حضرت اکبر نے فرمایا تھا۔

اب الہ آباد میں سامان نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے سوا اکبر کے اور امرود کے

لیکن اس وقت بھی الہ آباد میں پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ جن کا خاندان پچیس سال سے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔ مدن موہن مالویہ تھے جن کی سیاست نے قومی زندگی کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ سر تیج بہادر سپرو تھے جن کی فارسی اور عربی کی قابلیت کا لوہا بڑے سے بڑے مولوی مانتے تھے۔ سر محمد سلیمان تھے جنھوں نے نظریۂ اضافیت پر اسوقت تنقیدی مقالہ لکھا تھا جب دنیا میں اس کے سمجھنے والے دس یا گیارہ سے زیادہ نہ تھے۔

کون ہے جس کو وہ گلی کوچے یاد نہ آتے ہوں۔ جہاں اس نے پرورش پائی جہاں اس کے جسم و جان کو توانائی حاصل ہوئی اور جہاں اس کی آرزوؤں حوصلوں اور تمناؤں کی تشکیل ہوئی۔ سکوُن کے سراب، معاش کی تلاش اور ایام کی گردش نے کہاں سے کہاں پہنچایا۔ لیکن اب بھی میرے خوابوں کی دنیا میں الہ آباد ہی بسا ہے۔ آنکھ بند کرتا ہُوں تو وہی چوک، وہی گھنٹہ گھر، وہی گدڑی بازار وہی گلیاں، وہی سڑکیں، وہی اژدہام، وہی میلے، وہی گرد و غبار نظر آتے ہیں جن میں پہلے گودی میں، پھر باپ کی انگلیاں پکڑ کر اور پھر جوانی کی رعُونت میں گھومتا

پھرتا رہا۔ میرے لیے اب یہ ایک غیرحقیقی دُنیا ہے، ملک اور دین کے دُشمنوں کا مسکن ہے۔ وہ جگہ ہے جس کو اختیاری طور پر چھوڑ کر ذوق وشوق سے دُنیا کی خاک چھاننے نکلا تھا۔ پھر بھی اس کی محبّت میری جان اور میرے دل سے وابستہ ہے۔ لیکن اب اس کو دیکھنے کی امید باقی نہیں۔

دریں کنجِ قفس دانم کہ آخر بایدم مردن
کہ گر ایں است صیادم نہ خواہد کرد آزادم

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

۱۲- دسمبر ۱۹۰۷ء کو قید حیات میں آیا۔ فجر کا وقت تھا کہ گھر والوں نے پہلی مرتبہ میرے رونے کی آواز سُنی۔ الہ آباد میں ایک مشہور مجذوب تھے۔ ان پر لوگوں کو بہت اعتقاد تھا۔ گھروں میں ان کے آنے جانے پر پابندی نہ تھی اور نہ عورتیں ان سے پردہ کرتی تھیں۔ وہ زچہ خانے میں گھس آئے اور گود میں اُٹھا کر اُچھالتے رہے اور کہتے رہے۔ بادشاہ ہوگیا، بادشاہ ہوگیا۔ والدین نے اس سے نیک فال لی اور خوش بختی کی پیش گوئی سمجھا۔ گو میں ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوا لیکن سرکاری کاغذات میں میری پیدائش ۱۹۰۶ء لکھی گئی۔ اس وقت قاعدہ تھا کہ جب تک سولہ برس عمر نہ ہو لڑکے انٹرنس کا امتحان نہ دے سکتے تھے۔ اسکول میں داخلے کے وقت حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ امتحان کے وقت عمر کم ہوگی اس لیے عمر زیادہ لکھائی گئی اور سرکاری کاغذات میں وہی عمر قائم رہی۔

بدامِ نیستی افتادم از افسون ایں ہستی
گر ایں افسانہ را باور نمی کردم چہ می کردم

جات اور پات کو یاں نا پُوچھے کوئے
ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

بزرگ بغداد سے بھاگ کر دلّی آئے۔ وہاں سے دیو بند پہنچے پھر الہ آباد آکر آباد ہوئے پر دادا کا شمار رئیسوں میں ہوتا تھا۔ غیروں کے قبضے میں میں نے ان کی حویلی دیکھی۔ اس میں بہت بڑا تہہ خانہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس تہہ خانہ کی دیواروں میں سونے کی اینٹیں تھیں اور روپے تول کر جمع کیے جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بغاوت کی سزا میں پھانسی پائی۔ الہ آباد کے چوک میں ایک پرانا درخت تھا۔ والد دکھاتے تھے کہ اس کی شاخوں سے تمھارے پر دادا پھانسی پر لٹکائے گئے تھے۔ الہ آباد کی گرینڈ ٹرنک روڈ پر کسی زمانے میں سینکڑوں درخت تھے جن سے باغی پھانسی پر لٹکاتے گئے تھے۔ یہ آخری درخت تھا جو میں نے دیکھا۔ اب وہ بھی نہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ آج کی اصطلاح میں وہ مجاہدین آزادی میں تھے اور اس لحاظ سے بلند مرتبہ سمجھے جائیں گے۔ اس وقت باغی کہلائے۔ اور پھانسی کے سزاوار سمجھے گئے۔ والد کا نام ممتاز احمد تھا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو ان کو سرکاری ملازمت میں عسرت کی زندگی بسر کرتے پایا۔ الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم تھے اور قلیل تنخواہ میں سفید پوشی قائم رکھتے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ سر سیّد کے خیالات کے حامی تھے۔ پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہوئیں۔ یہ ان کا ہی حوصلہ تھا کہ عسرت کی زندگی کے باوجود لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور زمانے کے

دستور کے مطابق لڑکیوں کو علم سے سنوارا اور قرینے سے شادی کی میں ساتواں بچہ تھا۔ میری تعلیم اور پرورش کچھ آسان نہ تھی۔ پھر بھی ناز سے پالا اور اچھی تعلیم دی۔

چار بہنوں اور ایک بھائی کا انتقال ہوچکا۔ بڑے بھائی نے انسپکٹر آف سکولز کے عہدے سے پنشن پائی۔ مجھ سے چھوٹے الہ آباد میں ڈاکٹری کر رہے ہیں انھوں نے پاکستان آنا چاہا تو میں نے منع کیا اور کہا کہ الہ آباد کے ہزاروں مسلمانوں کو تم سے تقویت ہے۔ پاکستان میں ڈاکٹروں کی کمی ہے۔ اگر تم پاکستان چلے آتے تو یہاں سے زیادہ کماؤ گے۔ لیکن بہتوں کے قدم اکھڑ جائیں گے اور پریشان ہوکر تمھاری پیروی میں برباد ہوں گے۔ اُنھوں نے میرا مشورہ قبول کیا۔ ہندوؤں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ فسادات میں ان کے گھر کو آگ بھی لگائی گئی۔ لیکن دوسروں کے خیال سے اپنی جگہ پر جمے ہیں۔ سب سے چھوٹے انسپکٹر آف سکولز ہیں اور ان دقتوں میں سرکاری ملازمت کر رہے ہیں جن میں ہر ہندوستانی مسلمان مبتلا ہے۔

بہ پیری خاک بازیگاہ طفلاں می کنم برسر
کہ شاید بشنوم زاں خاک بوئے خوردسالی را

ختنہ کے وقت میری عمر اتنی ہو چکی تھی کہ اس کی تفصیل بخوبی یاد ہے۔ ایک دن صحن میں تخت بچھا۔ اس پر شامیانہ لگایا گیا اور صحن کے چاروں طرف چونے سے نقش و نگار بنائے گئے۔ سب کہہ رہے تھے کہ آج مشتاق دولہا بنیں گے۔ بہت سے مہمان آئے۔ میرے لیئے عمدہ کپڑے بنائے گئے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ لیکن دل کہہ رہا تھا کہ کوئی خوف ناک کارروائی ہونے والی ہے اور یہ سب باتیں مجھے بہلانے کے لیے کی جارہی ہیں۔ میرے والد کے رشتے کے ایک ماموں تھے۔ ہم انھیں بلّو دادا کہا کرتے تھے خاندان میں جب کسی کا ختنہ ہوتا تو وہی بچے کو گود میں لے کر بیٹھتے۔ جیسے ہی انھوں نے مجھے گود میں لیا میں نے رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔ ان کی داڑھی میں اس زور سے دانت کاٹا کہ خون نکل آیا۔ لیکن وہ اس کام میں ماہر تھے۔ صحیح طریقے سے لے کر بیٹھے اور خوبی سے آپریشن کرایا۔ مجھے لاکر پلنگ پر لٹایا گیا۔ طرح طرح کے کھلونے دیئے گئے۔ مٹھائی اور میوہ پیش کیا گیا۔ لیکن مجھے ان چیزوں کا کب ہوش تھا۔ معلوم نہیں کب تک روتا رہا۔ تھک کر سو گیا۔ اس کے بعد مجھے بلّو دادا سے دشمنی ہوگئی اور کہا کرتا تھا کہ بڑا ہوں گا تو ان کو مار ڈالوں گا۔ ان کی نگاہیں کمزور تھیں۔ عینک کے بغیر وہ بے بس ہوتے۔ زخم مندمل ہوگیا تو میں

نے ان کی عینک چرا کر چھپا دی۔ آخر پکڑا گیا اور سخت سزا پائی۔

اللہ بخشے بلّو دادا کو، انھوں نے ایک فرض انجام دے کر مجھے زندگی کی ایک اہم منزل طے کرنے میں مدد دی اور میں نے اس کے بدلے میں ان سے دُشمنی کی اور انھیں تکلیف پہنچائی۔ اب اسے بچپنے کی حماقت سمجھیں یا اس فطرتِ انسانی کا عریاں مظاہرہ جس کے مطابق انسان نیکی کا بدلہ بدی سے دیتا ہے

ایک دن باہر سڑک پر اژدہام تھا۔ ابھی سہ پہر کا وقت تھا۔ آسمان پر ایک تارا نظر آرہا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے دیکھو وہ جرمن ہوائی جہاز آگیا۔ شاید یہ کوئی دمدار سیّارہ یا شہاب ثاقب ہوگا۔ پہلی عالمی جنگ شروع تھی۔ انگریزی حکومت کا بول بالا تھا۔ بزرگ کہتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف گھر میں بھی کوئی بات نہ کرو۔ در و دیوار کے کان ہوتے ہیں۔ لیکن آزادی کی تمنا لوگوں کے دلوں میں تھی۔ جرمنی کی فوجی طاقت میں انھیں انگریزوں کی تباہی اور اپنی آزادی کی امید جھلکتی نظر آتی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ دن کو ستارہ نظر آیا تو اس کو جرمن جہاز سمجھا گیا۔

گھر میں ایک ملازمہ تھی جس کا نام اتّمی تھا۔ اتّمی مجھے بہت عزیز تھی۔ اب بھی یاد آتی ہے۔ میری ٹانگوں پر پھنسیاں نکلیں جو اچھی نہ ہوتی تھیں۔ اچھے نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان میں سخت کھجلی رہتی تھی اور میں ان کو نوچا کرتا تھا۔ والدہ کے لیے یہ سوہانِ روح تھا۔ ایک مرتبہ جھنجھلا کر اسی بات پر مجھے مارا۔ دوسرے دن اتّمی سو کر اٹھی تو کہا کہ رات میں نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا ہے کہتے تھے اس بچے کو ناحق سزا ملی۔ اس کو فجر کے وقت مسجد میں لاؤ دوسرے

دن وہ صبح نماز کے وقت لے کر مجھے مسجد میں گئی۔ ایک پیالی میں تیل ساتھ لے گئی۔ کہتی تھی کہ وہی بزرگ جن کو خواب میں دیکھا تھا مسجد سے نکلے۔ کچھ پڑھ کر مجھ پر پھُونکا اور تیل پر بھی دم کیا۔ خدا کی قدرت دیکھو اسی تیل کے لگانے سے وہ دانے جو ڈاکٹروں کی دوا سے اچھّے نہ ہوتے تھے چوبیس گھنٹے میں سُوکھ گئے۔ مجھے نہ مسجد جانا یاد ہے نہ ان بزرگ کی شکل۔ ہاں زخموں کا کھجانا اب بھی یاد ہے اور ٹانگوں پر گہرے زخموں کے نشانات آج تک باقی ہیں۔ اب اس کو نفسیاتی علاج سمجھو یا عورتوں کی خوش اعتقادی۔ بہر صُورت میں نے جو والدہ سے سُنا تھا بیان کر دیا۔

اتمی کے ذکر سے یاد آیا کہ اس کو آٹھ آنے ماہوار تنخواہ ملتی تھی ہمارے گھر میں رہتی تھی اور ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ دیکھو تنخواہیں کس طرح بڑھتی ہیں۔ اب تو ستر یا اسیّ روپے ماہوار پر بھی ملازمہ نہیں ملتی پھر وہ خلوص اور وفاداری کہاں کہ جس گھر میں ملازم رہے اس کو اپنا سمجھے اور بچّوں کو اپنے بچّوں کی طرح پیار کرے اب ان باتوں کو غلامی کے زمانے کی روایت سمجھا جاتا ہے لیکن کسی کو اپنا بنانا اور کسی کا ہو کر رہنا وہ دولت ہے جس کا مول نہیں۔

میر اکبر حسین اکبر میرے والد کے ماموں تھے۔ ہم انھیں دادا میاں کہتے تھے۔ حقیقی دادا کا میرے پیدا ہونے سے قبل ہی انتقال ہو چکا تھا میرے لیے یہی دادا تھے اور ہمیشہ ویسی ہی شفقت کی جیسی پوتوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہم عشرت منزل سے متصل ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو اصل میں عشرت منزل کا ایک حصّہ تھا۔ ان کا دستور تھا کہ عید کے دن سب بچّوں کو ایک ایک آنہ

عیدی دیا کرتے تھے ایک عید پر میں حسب دستور سلام کو حاضر ہوا۔ اور اکنّی عیدی پائی۔ حضرت اکبر دوپہر کو قیلولہ فرمایا کرتے تھے۔ سو کر اٹھے تو مجھے طلب کر کے پوچھا کہ وہ اکنّی کہاں ہے جو صبح ملی تھی۔ خوف سے جان نکل گئی کہ یہ کیا ماجرا ہے ڈرتے ڈرتے اکنّی پیش کی۔ وہ لے کر رکھ لی اور مجھے چونی عنایت کی۔ بعد میں والدہ سے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ اس لڑکے کی وقعت دوسروں سے زیادہ ہے اور اس کو چونّی ملنی چاہیے۔ اس کے بعد مجھے ہر عید پر چونّی ملتی رہی۔

الہ آباد میں پہلی مرتبہ ہوائی جہاز کا آنا بھی یاد آتا ہے۔ سارے اسکول، کالج اور دفاتر بند کر دیئے گئے۔ سارا شہر امنڈ کر قلعہ کے سامنے میدان میں جمع تھا میں بھی والد کے ساتھ گیا۔ زمین پر چونے سے صلیب کا نشان بنایا گیا تھا۔ تاکہ ہواباز جگہ پہچان لے۔ کوئی چیل اوپر سے گزرتی تو غلغلہ ہوتا کہ وہ جہاز آگیا۔ جہاز ران راستہ بھول گئے اور بنارس کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے پھر واپس ہوئے گیارہ بجے صبح پہنچنا تھا۔ شام کے چار بجے پہنچے۔ سارا شہر دن بھر دھوپ میں منتظر جمع رہا۔ ٹائیگر ماتھ سے بھی چھوٹا جہاز تھا۔ یہی اس زمانے میں ایک معجزہ سمجھا جاتا تھا۔ آج کل کے عظیم الشان جہاز جو آواز سے زیادہ تیز چلتے ہیں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتے تھے۔

اگر نہ مدّ بسم اللہ بودی تاج عنوان ہا
نہ گشتی تا قیامت نو خط شیرازہ دیوان ہا

چار برس کا ہوا تو والدین کو تعلیم دلانے کی فکر ہوئی۔ تعلیم کی ابتداء بسم اللہ سے ہوئی۔ اس رسم کی بڑی اہمیت تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا کسی بزرگ سے کرائی جاتی تھی۔ ہمارے خاندان کا تعلق خواجہ حسن نظامی دہلوی سے بہت گہرا تھا۔ میری بسم اللہ خواجہ صاحب نے کرائی۔ بسم اللہ پڑھا کر سورۃ اقراء کی آیتیں پڑھوائیں۔ فاتحہ دی۔ دعا کی۔ مٹھائی پہلے مجھے دی۔ پھر حاضرین میں تقسیم کی۔ کیا مبارک رسم تھی۔ اسے خواجہ صاحب کی دعا کا نتیجہ سمجھیے کہ علم کی طلب، اور حصولِ علم کی ہمت آج بھی برقرار ہے۔ پچپن برس کی عمر میں فرانسیسی سیکھی اور اس نئی زبان میں لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں مہارت حاصل کی۔ اب عربی کی گردانیں یاد کرتا ہوں۔

ہیچ گہہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

بنام خداوند جان آفرین
حکیم سخن در زبان آفرین
خداوند بخشندہ و دست گیر
کریم خطا بخش پوزش پذیر

بچوں کو شروع ہی سے سرکاری اسکولوں میں بھیجنے کا دستور کب کا شروع ہو چکا تھا۔ لیکن پرانے گھرانے ابتدائی تعلیم گھر میں دینی پسند کرتے تھے۔ مکتب بھی ہر محلے میں موجود تھے۔ میرے لیے ایک مولوی صاحب رکھ دیے گئے یا یوں کہو کہ پہلے ہی موجود تھے۔ محمد یاسین نام تھا۔ آنکھیں کمزور تھیں۔ لیکن فارسی، اُردو اور حساب میں ماہر تھے۔ ہمارے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے کو انھوں نے ہی پڑھایا۔ مشہور تھا کہ جس کو مولوی یاسین نے پڑھایا قابل اور عالم ہوا۔ پہلے بغدادی قاعدہ شروع کیا۔ اس کے بعد کلام پاک کی باری آئی۔ جب تک قرآن کریم ختم نہ ہوا اور کچھ نہیں پڑھا۔ اس کے بعد حساب اور اُردو شروع کیا۔ جس نے کلام پاک پڑھنا سیکھ لیا اس کے لیے اردو پڑھنا کھیل تھا۔ خصوصاً جب گھر کی زبان اُردو تھی۔ حساب میں کچھ دقت محسوس ہُوئی۔ لیکن معاملہ چل نکلا۔ انگریزی والد صاحب خود پڑھاتے تھے۔ کنگز پرائمر اب بھی یاد آتی ہے۔ آر اے ٹی ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا سی اے ٹی کیٹ۔ کیٹ معنی بلّی رٹا کرتا۔ زبان سکھانے کا یہ طریقہ اب بہت فرسودہ سمجھا جاتا ہے لیکن جب جدید طریقوں سے تعلیم پاتے ہوتے لڑکوں سے مقابلہ کیا

تو الحمداللہ میں نے اپنی انگریزی کی استعداد ان لوگوں سے کبھی کم نہ پائی ابتدائی تعلیم میں سب سے اہم کردار والدہ کا تھا ۔ وہ خود تو کچھ پڑھا نہ سکتی تھیں لیکن سبق یاد نہ کرو تو سزا دینے میں تامل نہ کرتیں اور تختی لکھ کر دکھاؤ تو جیب خرچ کے پیسے ملتے۔ فی صفحہ ایک پیسہ مقرر تھا۔ اس طرح محنت سے اپنے اخراجات پورے کرنے کی اور لکھنے پڑھنے کی عادت ہوئی اور پھر یہ عادت کبھی نہ چھوٹی۔ والدہ کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کوئی بچہ نماز سحر کے وقت نہ اٹھتا تو وہ پلنگ الٹ دیتیں۔ کہتی تھیں کہ صبح کو سونے سے گھر میں نحوسیت پھیلتی ہے اس طرح صبح سے اٹھ کر کام کرنے کی جو عادت ہوئی وہ اب تک قائم ہے

ہر گنج سعادت کہ خدا داد بہ حافظ
از یمن دعائے شب و ورد سحری بود

شبے دعوتے بود در کوئے من
زہر جنس مردم در او انجمن
چو آواز مطرب برآمد زکوئے
بگردوں شد از عاشقاں ہائے ہوئے

والد علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے ہمیشہ سر سیّد کے سکھاتے ہوئے اصولوں کے پابند رہے۔ انھوں نے ناچ مجرے کو ہمیشہ گناہ عظیم سمجھا۔ میرے بڑے بھائی نثار احمد کی شادی ہُوئی تو نہایت خاموشی سے۔ نہ بینڈ نہ باجا نہ مراثنیں، چند لوگ خاموشی سے گئے اور نکاح ہوگیا۔ پھر کچھ لوگوں کو بلاکر ولیمہ کر دیا۔ اور بات ختم ہُوئی۔ لیکن پھوپھا جان ڈاکٹر سید زاہد حسین کے حوصلے اور تھے۔ ان کے لڑکے سیّد شبیر حسین انکم ٹیکس آفیسر کی شادی کا انداز بالکل دُوسرا رہا۔ بارات کے ساتھ دو طائفے گئے۔ ہندوستان کی مشہور ترین مغنّیہ جانکی بائی اور الہ آباد کی حسین ترین رقاصہ منّی جان۔ باجا۔ آتش بازی۔ شور وغل۔ سمدھیانے والوں کی مصیبت کیونکہ ایسی بارات میں شرکاء کی تعداد متعین کرنی ناممکن ہوتی ہے۔ محلے والے اور سڑک چلتے بھی شریک ہو جاتے اور لڑکی والوں کی مدارت میں اگر مہمانوں کی کثرت سے کمی رہ جاتی تو شہر میں غلغلہ ہو جاتا۔ ویسے تو میرے لیے ناچ دیکھنے کا اب تک کوئی موقع نہ ہُوا تھا۔ لیکن کیسے ممکن تھا کہ پھوپھی زاد بھائی کی شادی میں شرکت نہ ہو۔ بارات کے سارے ہنگامے میں شریک رہا۔ ناچ بھی دیکھا اور گانا

بھی سنا اور وہ مکروہ مذاق بھی سنے جن کہ بغیر اہلِ ذوق کے لیے مُجرا بے معنی ہوتا ہے۔ اس عمر میں اس قسم کے مذاق سننے سے جو کیفیت ہوئی بیان سے باہر ہے۔ بدنظمی اور ہنگامے سے طبیعت پریشان تھی لیکن تین بجے رات تک شریک رہا۔ پھر گھر آکر سو گیا۔ وہاں ہنگامہ جاری رہا۔ اور دوسرے دن سہ پہر کو رخصتی ہوئی۔ اس طویل مدارات میں میزبانوں پر کیا گزری اس کا کسی کو خیال بھی نہ آیا اور جو دولت ضائع ہوئی اس کا حساب نہیں۔ کتابوں میں پڑھتا ہوں کہ مسلمان نکاح کرتے تو چند کھجوریں مہمانوں کے آگے رکھ دیتے۔ یہ ہندوؤں کا دستور تھا کہ عمر بھر لنگوٹی باندھتے ایک ایک کوڑی جمع کرتے اور شادی بیاہ میں دولت لٹاتے۔ مسلمان روزمرہ کی زندگی میں بھی فضول خرچی کرتے اور بچوں کی شادیوں میں شان و شوکت اور دھوم دھام میں ہندوؤں کے مقابلے میں کمی نہ کرتے۔ جب تک ہندوؤں پر حکومت تھی اس میں پولیٹیکل مصلحت تھی۔ لیکن حکومت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد یہ عادت معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اب ناچ رنگ کا عام دستور تو نہیں پھر بھی شادیوں میں جو اسراف ہوتا ہے اور جس اظہار شوکت کی کوشش کی جاتی ہے اس کو دیکھ کر دل دکھتا ہے۔ گھر بجلی کی روشنی سے منوّر۔ مہندی کی رسم، اس میں دعوت۔ بارات کی دعوت، ولیمہ کی دعوت، مٹھائی کی تقسیم، سمدھی کا جوڑا، سمدھن کا جوڑا، بہنوں کا جوڑا بلکہ دور کے عزیزوں کا جوڑا۔ غرض کہ ہزاروں نئی رسمیں پیدا ہو گئی ہیں۔ جن میں فضول خرچی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اُمرا اگر یہی دولت تعمیری کاموں پر صرف کریں تو ہزاروں غریبوں کے پیٹ پلنے کا سہارا ہو۔ افسوس کہ کچھ سماجی دباؤ کی بدولت اور

کچھ بچوں کی خوشی کی خاطر میں خود صحیح راستے پر نہ چل سکا۔

اس گلشن ہستی سے چھٹنا ممتازؔ نہیں آساں اتنا
ہر کانٹا دامن کھینچے ہے ہر پھول گریباں مانگے ہے

رشک بردن لازم عشق است بر ہر کس کہ ہست
ہر کہ در بزم است بارِ خاطرِ پروانہ ہست

بشیر بھائی کے ولیمہ کی دعوت ہوئی۔ سید عشرت حسین کے صاحبزادے سید محمد عقیل رضوی بھی تشریف لائے۔ عمر میں مجھ سے ایک سال چھوٹے مگر ذہانت اور گرمی کلام میں بہت آگے۔ مخمل کی شیروانی، چوڑی دار پاجامہ، کامدار ٹوپی۔ سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میری تعلیم اُردو اور حساب تک محدود تھی۔ یہ فارسی اور عربی پڑھتے تھے۔ عربی میں تو فعَلَ۔ فعَلَتْ۔ فعَلْتَ۔ فعَلْتِ۔ فعَلْتُ سے آگے نہ بڑھے تھے۔ لیکن فارسی میں گلستان ختم کر کے بوستان تک پہنچ چکے تھے۔ کسی سے پوچھا کہ اس شعر کے معنی بتایئے۔

قرص خورشید در سیاہی شد
یونس اندر دہان ماہی شد

پھر اس پر بحث ہوتی رہی۔ میں خاموش ایک کونے میں بیٹھا سنتا رہا رشک اور کم علمی کے غم سے رات بھر سو نہ سکا۔ دُوسرے دن اُٹھا تو فارسی پڑھنے کا جنون سوار تھا۔ مولوی لیٰسین فارسی میں بڑی قابلیت رکھتے تھے۔ ان سے فارسی پڑھانے کی درخواست کی تو بولے۔ "دھت ـــــ سسر اب فارسی پڑھیئے۔ پڑھیں فارسی بیچیں تیل"۔ لیکن مجھے کب چین آتا تھا۔ اماں کی خوشامد کی۔ آمدنامہ اور گلزار دبستان لایا۔ کھیل کود، کھانا پینا اور سونا چھوڑ کر انھیں

یاد کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت تک چین نہ آیا۔ جب تک گلستان میں مذکورہ بالا شعر تک نہ پہنچا۔ پھر آگے مطالعہ جاری رکھا۔ اسکول یا کالج میں فارسی پڑھنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ سائنس کورس لے رکھا تھا۔ لیکن عقیل بھائی سے رشک نے اتنی استعداد پیدا کر دی کہ اس کی ضرورت نہ ہوتی۔ تکلف برطرف میری جوانی تک فارسی پر عبور مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ بہت سے ہندو بھی فارسی دانی پر فخر کرتے تھے۔ اسی لیے اس زبان کو سیکھنے کا شوق برقرار رہا۔ انگریزی تعلیم کے عروج سے فارسی دانی کی عزت اور قدر رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔

شرمم آید از تہی دستی کہ در ایں روزگار
عشق رسوائی کزاں سرمایہ اندوزیم نیست

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

گیارہ برس کی عمر ہوئی تو اسکول میں داخلے کا سوال پیدا ہوا۔ الہ آباد میں کئی اسکول تھے ان میں گورنمنٹ ہائی سکول سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ والد اسی سکول میں لے گئے اور چھٹے درجے میں داخلہ کرادیا۔ دوسرے دن اکیلا اسکول پہنچا۔ ہر طرف حیران و پریشان دیکھا کیا۔ یہ نئی دنیا تھی۔ نئے ہم سبق۔ قریب قریب سب ہندو۔ نئے اساتذہ وہ بھی ہندو۔ نئے مضامین جن میں سے بعض کا نام بھی نہ سنا تھا مثلاً تاریخ، جغرافیہ، ڈرائینگ۔ گھر پر ان چیزوں کا تذکرہ ہی نہ تھا۔ اب اکبارگی ان تمام مضامین کو ان لڑکوں کے ساتھ شروع کرنا پڑا جو یہ کئی سال سے پڑھ رہے تھے شروع شروع میں وحشت اور پریشانی کی انتہا نہ تھی۔ لیکن جلد ہی وہ لوگ جو پہلے اجنبی تھے دوست ہو گئے اور نئے سبق سمجھ میں آنا شروع ہو گئے۔ امتحانات کا زمانہ پریشانی کا زمانہ ہوتا۔ کھیلنا کودنا اور کھانا پینا بھی تیاری کی مصروفیت میں بھول جاتا۔ نتیجہ معلوم ہونے کا دن امید و بیم کا ہوتا۔ لیکن الحمد اللہ کامیابی ہمیشہ نصیب ہوئی۔

اسکول سے متصل ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ اس میں سب مسلمان بچے نماز ظہر کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اس اجتماع کی بدولت امیر، غریب۔ سینئر، جونیئر سارے مسلمان لڑکوں میں بڑی یک جہتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہی اسکول جس میں خوف دہراس

سے داخل ہوا تھا۔ زندگی کا عزیز ترین جزو بن گیا۔ آج بھی اس کی یاد میرے دل میں تازہ ہے۔

کردم سفر از کوئے تو شاید روی از یاد
فریاد کہ جز یاد تو ام ہم سفری نیست

بامن آویزش او الفت موج است وکنار
دم بدم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من

ہندوؤں میں رہنا۔ ساتھ پڑھنا، ساتھ کھیلنا۔ محبت اور دوستی۔ اور پھر ان کا حقارت آمیز رویہ اور ایسا برتاؤ جو صرف ناپاک جانوروں کے ساتھ جائز ہے زندگی میں ایک عجیب تضاد پیدا کرتا اور محبت اور نفرت۔ یگانگت اور دشمنی کے جذبات ساتھ ساتھ برانگیختہ کرتا رہتا۔

ہندو سے ملاقات ہو تو وہ ہاتھ نہ ملاتا۔ گلے نہ لگاتا۔ دُور سے ہاتھ جوڑ کر سلام کر لیتا۔ ہندو حلوائی کی دکان سے کچھ خریدو تو پتوں کے دونے میں دور سے ہاتھ میں ٹپکا دیتا کہ کہیں مسلمان کا ہاتھ نہ لگ جائے جہاں ہندو کھانا کھاتا ہو وہاں مسلمان کا سایہ پڑ جائے تو قیامت آجائے۔

زندگی میں پہلا ریل کا سفر کیا تو ایسا تلخ سبق ملا کہ آج تک نہ بھولا۔ بنارس جانا تھا۔ بھائی صاحب اسٹیشن تک آئے۔ انٹر کلاس کا ٹکٹ دلا کر گاڑی تک پہنچا گئے۔ ڈبہ میں داخل ہوا تو بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ایک سیٹ پر ترکاری کی ٹوکری رکھی تھی۔ بے سوچے سمجھے اس کو اٹھا کر نیچے رکھ دیا اور بیٹھ گیا۔ گاڑی ہندوؤں سے بھری ہوئی تھی۔ ابھی سانس بھی نہ لی تھی دیکھا کہ سب مشتعل ہو رہے ہیں۔ جن بابو جی کی ترکاری تھی انھوں نے ڈانٹنا شروع کیا۔ مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ دُوسرے مسافر بھی پیچھے پڑ گئے

مجھ میں لڑائی کی طاقت کہاں تھی۔ معذرت شروع کی معافی مانگی ایک پیش نہ گئی۔ آخر کسی نے بیچ بچاؤ کیا اور یہ فیصلہ صادر کیا کہ آٹھ آنے کی ترکاری ہو گی۔ اس کے دام ادا کرو اور ترکاری خود لے جاؤ۔ یہ میرے لیے بڑی رقم تھی۔ لیکن خوف طاری تھا۔ پیسے نکالے اور بابو جی کے حوالے کیے۔ اس طرح اپنی جان بچائی۔ ترکاری میرے کس کام کی تھی۔ اترتے وقت گاڑی میں چھوڑ آیا۔ میرے لیے چارہ ہی کیا تھا۔

اسی نوعیت کا دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب ایم اے میں پڑھتا تھا بینی بہادر ماتھر ساتھ پڑھتے تھے۔ ان کے ریلوے میں ملازمت کے احکام آئے تھے خوشی میں ایک دوسرے ہندو ساتھی آنند نرائن نے ان کی الوداعی دعوت کی تھی۔ مجھے نہ بلایا گیا۔ نہ مجھے اس دعوت کا علم تھا۔ حسب دستور سب ساتھ یونیورسٹی سے روانہ ہوئے۔ راستے میں سب سائیکل سے اتر پڑے۔ میں بھی اتر گیا۔ سب آنند نرائن کے گھر میں داخل ہوتے میں بھی ساتھ ساتھ چلا گیا۔ دیکھا تو وہاں دعوت کے انتظامات ہیں۔ مٹھائیاں میز پر چنی رکھی ہیں۔ نہ جاتے ماندن نہ پائے رفتن معذرت کر کے واپس ہونا چاہا۔ بینی بہادر نہ مانے۔ بیٹھنے کو کہا۔ بیٹھ گیا۔ انھوں نے مٹھائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا مشتاق شروع کرو۔ میں نے بادل نخواستہ ایک ٹکڑا لے لیا۔ سب بیٹھے دیکھتے رہے۔ کسی کا ہاتھ نہ ہلا۔ کچھ دیر سکتے کے عالم میں گزرا۔ پھر میزبان نے ملازم کو آواز دی۔ کہا یہ مٹھائی اب چھونے کے قابل نہیں۔ جمعدار کو بلاؤ اسے لے جاتے۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مہمان خصوصی کو بھی ناگوار ہوا۔ اٹھ بیٹھے اور مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں کہتا رہا کہ تم بیٹھو میں جاتا ہوں

وہ نہ مانے۔ شرمندہ اور پشیمان اُٹھ کر چلا آیا۔ آج تک اس واقعہ کو یاد کرتا ہُوں تو اپنی حماقت پر ندامت ہوتی ہے۔

اس قسم کے توہین آمیز واقعات اکثر پیش آئے۔ ان دو کی تلخی زیادہ محسوس ہُوئی اس لیے تذکرہ کیا۔ ہندوؤں کا یہ رویّہ مسلمانوں سے اختلاف کا بڑا سبب تھا۔

چھوت چھات ہندوؤں کے مذہب کا بنیادی اصُول تھا۔ اس کی بنا اس وقت پڑی تھی جب آریہ ہندوستان میں داخل ہُوئے اور اپنی نسل خالص رکھنے اور نسلی برتری برقرار رکھنے کے لیے یہاں کے اصلی باشندوں کے خلاف یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ اسے مذہبی حرمت حاصل ہوگئی۔ مسلمان حکمران اس ملک میں داخل ہوئے تو یہی حربہ انھوں نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ان کے خلاف استعمال کیا۔ مغلوں نے اپنی حکومت کی بنیاد ہندوؤں سے دوستی اور قرابت داری پر رکھنے کا فیصلہ کیا تو اس رسم کے احترام کا خیال رکھا۔ جب تک مسلمانوں کی سیاسی برتری قائم رہی ان کو یہ چنداں ناگوار نہ ہوتا۔ اور ایک پسماندہ قوم کی جہالت سمجھ کر اس کو نظر انداز کرتے رہے۔ اسی بنا پر ہندو مسلمانوں کا میل جول عرصے تک قائم رہا۔ لیکن جب انگریزوں نے ان کو تباہ کیا اور رفتہ رفتہ سیاسی اور معاشی برتری ہندوؤں کی طرف منتقل ہونے لگی تو ہندوؤں کے اس برتاؤ میں انھیں اپنی توہین نظر آنے لگی اور یہ آپس کے جھگڑوں کا باعث بن گیا۔ انگریزی تعلیم نے اور گاندھی جی کے چھوت چھات کے خلاف جہاد نے رفتہ رفتہ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کیا۔ ملازم ہو کر پنجاب آیا تو بہت سے

ہندوؤں کو ہم نوالہ وہم پیالہ پایا۔ ان ہی میں گیان پرکاش بھلا صاحب تھے۔ ان کے ساتھ ایک مدت تک ایک ہی گھر میں رہا۔ اسی عرصے میں ان کی بہن کی شادی ہوئی۔ ویسے تو شرکت لازمی تھی۔ لیکن ان کو اصرار تھا کہ باراتیوں کو کھانا کھلاؤ۔ سابقہ تجربوں کی بنا پر میں اس پر رضامند نہ تھا۔ لیکن ان کی ضد پر کھانا تقسیم کرنے لگا حیرت اس پر ہے کہ کسی نے اعتراض نہ کیا۔

بھلا صاحب تقسیم ہند کے بعد انڈین ریلوے بورڈ کے ممبر ہوئے۔ جب تک ہندوستان تقسیم نہ ہوا تھا ان سے اور ماتھور صاحب سے بھائیوں کی طرح مراسم رہے۔ اب معلوم نہیں کہاں اور کس حال میں ہیں۔ اکثر وہ اور دوسرے ہندو دوست یاد آتے ہیں۔

سالہا رفت و زبا دم نہ رود دوست ہنوز
تا چہ کردم کہ مرا دشمن جان اوست ہنوز

اڑنے کی اک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
شائستۂ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

۱۸۵۷ء کے مجاہدین کی اولاد انگریزی حکومت کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کے مفادات اب اسی سے وابستہ ہو چکے تھے۔ اپنے اسلاف کے قتل اور اپنی تباہی کی ابتداء بھول چکی تھی۔ انگریزوں سے وفاداری قابلِ فخر سمجھی جانے لگی تھی۔ ان کی حکومت کے اختتام میں اس نظام کی تباہی نظر آتی تھی جس کے سب عادی ہو چکے تھے۔ ہزار برس کی مسلسل غلامی کے بعد ہندوؤں میں یہ ہمّت نہ تھی کہ آزادی کا خواب دیکھ سکیں۔ لیکن مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی چنگاری ابھی دبی ہوئی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں وہ جنگ آزادی میں پیش پیش تھے۔ اس وقت ان کی سیاسی بالا تری مسلّم تھی۔ ان کے دلوں میں اب بھی یہ خواہش چھپی ہوئی تھی کہ انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ ہو تو وہ پہلے کی طرح اپنی شجاعت کی بنا پر ہندوستان کے حاکم بنیں۔ لیکن ہندوؤں کے ساتھ آزادی میں شرکت پر آمادہ نہ تھے۔ اب جمہوری طرز حکومت کا امکان تھا۔ ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ اندیشہ تھا کہ ان کی سیاسی بالادستی قائم نہ رہ سکے گی۔ ان کی نگاہیں مدت سے سلطنت عثمانیہ کی جانب لگی تھیں۔ شاید کبھی اس کی مدد سے ان کا کھویا ہوا اقتدار واپس مل جائے۔ بلقان میں، طرابلس میں الجزائر میں پے در پے شکست اور تباہی کا ماتم کرتے رہے۔ پھر انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر پہلی جنگ عظیم میں ترکوں سے لڑے اور سلطنت عثمانیہ کو مکمل طور پر

پارہ پارہ کرنے میں مدد دی۔ لیکن اس سلطنت کی تباہی کے ساتھ ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ یہ اب بھی ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے کو تیار نہ تھے۔ لیکن اس سلطنت کو جسے ترک اور عرب مسترد کر چکے تھے اور جسے انھوں نے خود تباہ کیا تھا دوبارہ وجود میں لانے کے لیے بے تاب تھے۔

میرے اسکول میں تعلیم کا زمانہ تھا کہ ان حالات میں گاندھی جی نے نان کوآپریشن کی پہلی تحریک شروع کی۔ لیکن ہندوؤں کی ہمّت نہ تھی کہ آزادی کا نعرہ لگائیں صرف ہوم رول کا مطالبہ تھا۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی تحریک خلافت لے کر اُٹھے۔ دونوں تحریکوں کی راہ میں انگریز حائل تھے۔ دشمن کا دشمن دوست ہو جاتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگنے شروع ہوئے۔

مسلمان بچے گاتے پھرتے تھے۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ہندو بچے بندے ماترم گاتے اور گاندھی جی کی جے کے نعرے لگاتے۔ اسکول کے لڑکے ان جلسوں میں بڑی تعداد میں جاتے تھے۔ میں بھی سب کے ساتھ جاتا تھا۔ خاک سمجھ میں نہ آتا کہ کیا ہو رہا ہے اور لیڈر کیا تلقین فرما رہے ہیں۔ اکثر ان تقریروں کی نقلیں اُتاری جاتیں اور ان کا مذاق اڑایا جاتا۔ لیکن مجمع کا انداز دیکھ کر خون میں جوش ضرور پیدا ہوتا۔ ان جلسوں میں نہرو خاندان کی عورتیں آتی تھیں مسز جواہر لال نہرو، وجے لکشمی اور کرشنا نہرو جلوہ افروز ہوتیں کچھ جوش و خروش کی فضا، کچھ ان کو گھورنے کا شوق کھینچ لے جاتا۔

من اگر نظر گناہ است، بسے گناہ دارم
چہ کنم نمی توانم کہ نظر نگاہ دارم

یہ وہ زمانہ تھا کہ اچھے گھرانے کی کوئی عورت گھر سے باہر نظر نہ آتی تھی۔ شریف مسلمان عورتیں اگر ایک گھر سے دوسرے گھر جاتیں تو ڈولی میں بیٹھ کر۔ ہندو عورتیں تہوار کے دنوں میں جمنا اشنان کو ضرور جاتیں۔ لیکن شرماتی، لجاتی، سر جھکائے گھونگٹ نکالے۔ انگریز عورتیں سول لائنز یا کنٹونمنٹ میں چلتی پھرتی تھیں لیکن عوام کو کم ہی نظر آتیں۔ نہرو خاندان کی عورتیں حسن و جمال، نفاست اور نزاکت کی پیکر، سپید کھدّر میں ملبوس وہ عجیب و غریب نظارہ پیش کرتیں کہ اس کو دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے۔ انھوں نے ہمّت کی تو ان کی پیروی میں عام ہندو عورتیں بھی گھروں سے نکل پڑیں۔ اور ہزاروں کے جلوس بنا کر سڑکوں پر گشت کرنے لگیں۔ یہ سب کھدر کی سپید ساریاں پہنے ہوتیں۔ ہاتھ میں تکلا ہوتا اور سوت کاتتی پھرتیں اس طرح نان کوآپریشن کی تحریک نے ہندو سوسائٹی میں عورت کے مقام میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس وقت ہر ہندو سوت کاتتا دکھائی دیتا۔ ہندوستان انگریزی کپڑے کی سب سے بڑی منڈی تھا۔ اور گاندھی جی کی تحریک کا بڑا جزو یہ تھا کہ انگریزی کپڑے کا استعمال بند کیا جائے تاکہ انگریزی معیشت کو نقصان پہنچے۔ بدیسی کپڑے جمع کر کے جلسوں میں آگ لگائی جاتی تھی اور ہر ہندو ہاتھ کا بنا ہوا کھدر پہننے کو فخر سمجھتا تھا۔ ایک جلسے میں نہرو خاندان کے کپڑے جلائے گئے۔ میں بھی دیکھنے گیا تھا۔ قیمتی اور زرق برق کپڑوں کا ایک پہاڑ تھا۔ جس میں آگ لگتی دیکھی۔ سنتے تھے کہ یہ کپڑے پیرس سے دھل کر آتے تھے۔ ان کو راکھ ہوتے دیکھا۔ دوسرے ہندوؤں نے بھی

پیروی کی اور پھر مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ بدیسی کپڑے جلانے اور کھدر پہننے میں شریک ہو گئے۔ لیکن اس معاملہ میں ان میں ہندوؤں کا سا جوش نہ تھا۔ مسلمان ہمیشہ خوش پوش رہے۔ موٹا کپڑا پہننا ان کو اچھا نہ لگتا۔ کانگریس کے رضا کار کسی کو بدیسی کپڑا نہ خریدنے دیتے۔ اور کوئی خریدنے جاتا تو اس کے سامنے لیٹ جاتے ہندو سرمایہ کاروں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور تیزی سے ملیں لگانی شروع کیں لوگ دگنے اور تگنے دام دیتے اور دیسی ملوں کا کپڑا خریدتے۔ اس کے خریدار زیادہ تر مسلمان ہوتے۔ فائدہ ہندوؤں کو پہنچتا۔ خود ہندو کھدر زیادہ پسند کرتے۔

ایک مرتبہ اعلان ہوا کہ اسکولوں میں اسٹرائک ہو گی۔ کچھ لڑکے ہمارے اسکول کے سامنے پکٹ کرنے لگے۔ مَیں بھی ان میں شریک تھا۔ دُوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے طلبی ہُوئی اور چھ بینتوں کی سزا ملی۔ ہاتھ سُوج گیا۔ لیکن فخر کے ساتھ کلاس میں سب کو دکھاتا پھرا۔ اسکولوں میں اسٹرائک کی تحریک کا اس وقت تو کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اور لڑکے پڑھنے لکھنے میں جلد ہی مصرُوف ہو گئے۔ لیکن یہ تعلیم کی اس بربادی کی ابتدا تھی جو اب انتہا پر پہنچی ہے۔

ایک مرتبہ الہ آباد میں لیڈروں کا بڑا اجتماع ہوا۔ گاندھی جی۔ شوکت علی، محمد علی، ابوالکلام آزاد، آزاد سبحانی، اور دوسرے لیڈر تشریف لائے۔ گاندھی جی کے درشن کے لیے دور دراز سے غریب کسان جمع ہُوئے۔ سڑکوں پر ہر طرف وہ اژدہام تھا کہ چلنے کی جگہ نہ تھی۔ ایک بہت بڑے میدان میں اُونچا پلیٹ فارم بنایا گیا۔ گاندھی جی کالے، دُبلے، سر پر کھدر کی ٹوپی، جسم پر صرف لنگوٹی۔ ڈائس پر بیٹھے چرخہ کات رہے تھے۔ زبردست تقریریں ہوئیں۔ مولانا محمد علی نے معرکتہ الآرا۔

تقریر کی۔ اپنی گرفتاری کی خبروں کی طرف اشارہ کرتے ہوتے یہ شعر پڑھا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہُوا

اس دن سے آج تک یہ شعر یاد ہے۔ گاندھی جی اُردو یا ہندی بڑی مشکل سے اور خراب لہجہ میں بولتے تھے۔ جب تمام لیڈر تقریر کر کے خراج تحسین وصول کر چکے تو ان کی باری آئی۔ فرمایا۔ "بھائیو اور بہنو! مجھے آپ سے کچھ کہنا نہیں ہے۔ بات کرنے کا وقت گیا کام کرنے کا وقت ہے۔ چرخہ کاتو، کھادی پہنو نمسکار"۔ اس کو ان کی شخصیت کا مقناطیسی اثر سمجھنا چاہیے کہ ان ٹوٹے پھوٹے جملوں نے لوگوں کو پاگل بنا دیا۔ وہ فلک شگاف نعرے لگے کہ زمین و آسمان ہل گئے۔ رات بھر گلی کوچوں میں گاندھی جی کی جے کی آوازیں گونجتی رہیں اس جلسے کے چند ہی دنوں بعد لیڈروں کی گرفتاری کی خبر آئی۔ لوگ دیوانہ وار سڑکوں پر نکل پڑے۔ پولیس ان پر گھوڑے دوڑاتی۔ یہ ایک جگہ سے منتشر ہوتے تو دوُسری جگہ جمع ہو کر نعرے لگاتے۔ میں خود کئی مرتبہ گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے آتے آتے بچا۔ کچھ دنوں یہی کیفیت رہی۔ ہزاروں گرفتاریاں ہُوئیں۔ بے سردار کی فوج آخر کب تک لڑتی۔ لوگ تھک کر بیٹھ گئے اور رفتہ رفتہ یہ تحریک دب گئی۔ لیکن یہ آگ تھی جس کے شعلے ایک مرتبہ اپنی چمک دکھا چکے تھے۔ اب دھواں اُٹھ رہا تھا۔ صرف اس کی دیر تھی کہ کوئی ہوا دے اور پھر بھڑک اُٹھے۔ اس کے بعد ہی تبلیغ اور شُدھی کے فتنوں نے سر اُٹھایا۔ اور لوگوں کی توجہ دوسری طرف مبذول ہُوئی۔

پہلے مسلمان لڑکوں میں ترکی ٹوپی اور ٹرکش کوٹ کا فیشن تھا۔ تحریک خلافت میں محمد علی کیپ جس پر چاند تارا لگاتے رائج ہوئی اور کھدر شیروانی کا فیشن شروع ہُوا۔ میں نے بھی یہی لباس اختیار کیا۔ میرے والد سرکاری ملازم تھے اور بغاوت کے اس اظہار سے ڈرتے تھے۔ وہ منع کرتے لیکن میں نہ مانتا۔

حضرت اکبر نے حالات حاضرہ پر ہمیشہ تنقیدی نظر رکھی۔ نان کوآپریشن کی تحریک ان کی توجہ سے کب بچ سکتی تھی۔ اس مضمون پر ان کے اشعار گاندھی نامہ کے نام سے شائع ہُوتے ہیں۔ ایک دن مجھے بلا کر کچھ کاغذات دیے۔ ان پر مختلف اشعار لکھے تھے جن کو انھوں نے ترتیب دیا تھا۔ فرمایا کہ تمھارا خط صاف ہے میں ان اشعار کو علیحدہ شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اگر چاہو تو تم انکو اس ترتیب سے نقل کر دو جو میں نے دی ہے میں نے فخر کے ساتھ قبول کیا اور بڑی محنت سے لکھ کر لایا۔ خوش ہُوئے خط کی تعریف کی اور فرمایا میں نے یہ کام تمھیں اس لیے سپرد کیا تھا کہ تم شعر سمجھتے ہو۔ ورنہ ہر شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس طرح گاندھی نامہ کا پہلا مسودہ لکھنے کی سعادت مجھے نصیب ہُوتی اور صلے میں جو تعریف ہُوئی اس کا نشہ آج تک باقی ہے۔

گاندھی نامہ کا ایک شعر ہے۔

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو گردِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اس میں شوکت علی اور محمد علی کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ایک دن حاضر خدمت تھا کہ کچھ لوگ ملنے آئے اور اس کا تذکرہ کیا

فرمایا کہ یہ مولانا محمد علی کا تذکرہ نہیں مسلمانوں کی عقل پر رونا ہے۔ گاندھی جی تو ہندوؤں کو ہزار برس کی غلامی سے آزاد کرانے کی فکر میں ہیں اور اس تحریک کے پردے میں ان کی مالی حالت بہتر بنا رہے ہیں مسلمان خلافت پر جان دے رہے ہیں۔ سنتا ہوں کہ مسلمان عورتیں چندے میں اپنے زیور دے رہی ہیں۔ ان کے پاس رہ ہی کیا گیا کہ مزید بربادی مول لیں۔ خلافت ترکوں اور عربوں کا معاملہ ہے۔ مسلمان اپنے کو تباہ کر کے معزول سلطان کو ترکوں کی مرضی کے خلاف تخت پر کس طرح بٹھا سکتے ہیں۔ انگریزوں کو مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنا تھا۔ وہ اپنا کام مکمل کر چکے۔ اب وہ چاہیں بھی تو خلافت دوبارہ بحال نہیں کر سکتے۔ اس بات پر لڑائی میں اپنے کو تباہ کرنا بدھوپن نہیں تو کیا ہے؟

غزلے زدم کہ شاید زنوا قرارم آید
تپ شعلہ کم نہ گردد زگسستن شرارے

ابھی نویں درجے میں تھا کہ تعلیمی نظام میں اہم تبدیلیاں ہوئیں یونیورسٹی میں داخلے سے پہلے دس سال کے بجائے بارہ سال تعلیم دینے کا فیصلہ ہوا۔ اور گورنمنٹ ہائی سکول بڑھ کر گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج ہو گیا۔ نئے نئے پروفیسر مقرر ہوئے۔ زیادہ تر ہندو۔ نئے آنے والوں میں سیّد مقصود حسین نقوی تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کی قابلیت کی بڑی شہرت تھی۔ ایک مسلمان پروفیسر کا آنا مسلمان لڑکوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ سب ان کی خدمت میں حاضر رہتے۔ مقصود صاحب جہاں مذہب کے پابند تھے وہاں شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کے اثر سے لڑکوں میں بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ الہ آباد میں مشاعروں کا بہت رواج تھا کئی روّساء کے گھروں پر سالانہ مشاعرے ہوتے۔ ان مشاعروں میں رینا صاحب کا مشاعرہ سب سے شاندار ہوتا۔ رینا صاحب کشمیری ہندو تھے۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں بھی بہت مشہور مشاعرہ ہوتا۔ یُو۔ پی میں قریب قریب ہر ضلع میں مشاعرہ کا رواج تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں مشاعرہ ہوتا۔ اس وقت مشاعرہ صرف اہلِ ذوق کا مجمع ہوتا ٹکٹ لگا کر عوام کو داخل کرنے کی کسی کو نہ سوجھی تھی۔ نقوی صاحب کی ہمت افزائی سے شوق ہوا کہ ہم اپنے کالج میں بھی مشاعرہ کریں۔ تیاریاں شروع ہوئیں چندہ

جمع کیا گیا۔ رؤسائے شہر کی سرپرستی حاصل کی گئی۔ میں ان تیاریوں میں پیش پیش تھا۔ میرے ساتھ پروفیسر نقوی کے چھوٹے بھائی مسعود حسین نقوی تھے جو بعد میں علی گڑھ میڈیکل کالج کے پرنسپل رہے۔ سیّد ابنِ حسن تھے، یہ الہ آباد کے ایک بڑے رئیس کے صاحبزادے تھے۔ اب کراچی میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سیّد منظور حسین موسوی پروفیسر عربک کالج دہلی تھے۔ ان دوستوں کا ایسا ساتھ تھا کہ لمحہ بھر ایک دوسرے کے بغیر زندگی ممکن نہ تھی اور اب ایسے چھٹے ہیں کہ ایک دوسرے کے حال کی بھی خبر نہیں۔ لیکن۔

یادِ یارانِ قدیم نہ رود از دلِ تنگ
چوں ہوائے چمن از یاد اسیرانِ قفس

نقوی صاحب نے مصرع طرح تجویز کیا۔

"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

شعر و شاعری کا مرکز لکھنؤ تھا۔ دو لڑکے لکھنؤ گئے کہ وہاں کے شاعروں کو مدعو کریں۔ آخر مشاعرے کا دن آیا۔ شامیانہ لگا۔ قالین بچھائے گئے۔ مسند سجی۔ مدعوئین جمع ہوئے۔ صدق جائسی۔ سیّد آل رضا، ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی، نوح ناروی سائل دہلوی، جگر مراد آبادی اور ظریف لکھنوی باہر سے تشریف لائے۔ صفی لکھنوی مسند صدارت پر تشریف فرما ہوئے۔ میں نے وجدی تخلص اختیار کیا۔ غزل پڑھنے بیٹھا تو منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ پسینہ آ رہا تھا۔ اساتذہ نے ہمت افزائی کی۔ پھر بھی مشکل سے تین چار شعر پڑھ سکا۔

مشاعرہ تین بجے رات تک چلا۔ مبتدیوں کے بعد اساتذہ کی باری آئی۔ ان

میں سائل، ثاقب اور آل رضا خاص طور پر یاد آتے ہیں۔ سائل داغ کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی جس میں سنہرا فیتہ لگا ہوا۔ جسم پر انگرکھا، گورا رنگ، سپید داڑھی ترنم سے کلام پڑھتے۔ سادگی اور محاورہ بندی ان کی خصوصیت تھی۔ ثاقب صاحب تحت اللفظ سے مشاعرے کو سر پر اٹھا لیتے۔ آل رضا صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا۔ جامہ وار کی شیروانی اور اسی کپڑے کی ٹوپی۔ نفاست اور نزاکت کا مرقع۔ دولہا میاں کہلاتے۔ اسی وقت سے ان کا شمار کہنہ مشق اساتذہ میں تھا۔ افسوس کہ اس مشاعرے کی طرحی غزلیں جو بڑی محنت سے لکھی تھیں ضائع ہو گئیں۔

میں نے نہ طبع موزوں پائی نہ حاضر طبیعت۔ چند ہی دنوں میں شاعر بننے کی کوشش ترک کر دی۔ لیکن تخلّص استعمال کرتا رہا۔ اب بھی اگر ایسا مضمون لکھتا ہوں جس کو اپنے معروف نام سے شائع کرنا مناسب نہیں ہوتا تو تخلّص ہی استعمال کرتا ہوں۔

مرا ز شعر خود آسائشے نہ شد ہرگز
کہ ہیچ کس نہ کند خواب از فسانۂ خویش

تنہا نہ من آشفتۂ آں زلف درازم
دیوانہ چو من ہست دریں سلسلہ بسیار

مشاعرے کی کامیابی سے ہندو لڑکوں میں رشک پیدا ہوا۔ ابھی کوی سمیلن یعنی ہندی مشاعرہ عام نہ ہوا تھا۔ ہندوؤں نے جواباً ڈرامہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے وسائل مسلمانوں سے زیادہ تھے۔ اسی اعتبار سے انھوں نے اہتمام بھی بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ لیکن جو ڈرامہ تجویز کیا وہ شہزادی زیب النساء اور شیوا جی مرہٹہ کی مفروضہ محبّت پر مبنی تھا۔ مسلمانوں کو یہ ناگوار ہوا۔ پرنسپل صاحب نے میٹنگ بلائی اور کہا کہ جن حصّوں پر اعتراض ہو پڑھ کر سناؤ۔ ہمیں کسی خاص حصہ پر اعتراض نہ تھا، ساری کہانی قابلِ اعتراض تھی۔ پرنسپل انگریز تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ تاریخی واقعہ ہے اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ ہم کہتے رہے کہ یہ کہانی تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ اور محض مسلمانوں کی توہین کی نیت سے ایجاد کی گئی ہے۔ انھوں نے ایک نہ سُنی۔ ڈرامہ ہوا، اور بڑے اہتمام اور شان وشوکت سے ہوا۔ مسلمان لڑکے اس میں شریک نہ ہوئے۔ شہر کی فضا پر بھی اس کا اثر ہوا۔ نقصِ امن کا اندیشہ تھا۔ لیکن ڈرامے کا دن خیر و خوبی سے گزر گیا۔ ہندو اپنی فتح سے خوش تھے مسلمان علیحدہ ٹولی بنائے خاموشی سے اپنے جذبات چھپائے پھرتے رہے۔

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

پیر میں پھوڑا نکلا۔ اس کی تکلیف سے بخار آنا شروع ہوا۔ آپریشن تک نوبت پہنچی۔ اس وقت نہ وہ دوائیں میسّر تھیں جن سے جسم کو بے حس کر دیا جاتا نہ پنسلین اور نہ دوسری انٹی بائیٹک دوائیں ایجاد ہوئی تھیں کہ زخم فوراً مندمل ہو جاتے۔ بھائی صاحب نے مضبوطی سے ٹانگ پکڑ لی اور ڈاکٹر نے نشتر لگا کر پیپ نکال دی۔ اس کے بعد روز کمپاؤنڈر آتا اور پٹی اُتار کر نیلے تھوتھے سے زخم کو دھوتا۔ اس میں روزانہ جو اذیت ہوتی وہ آپریشن کی تکلیف سے زیادہ تھی۔ ابھی بستر سے ہل نہ سکتا تھا کہ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو حضرت اکبر کا انتقال ہوا ہمارے گھرانے کے لیے یہ بڑا سانحہ تھا۔ حقیقی دادا کی محبت سے تو میں ناآشنا تھا۔ ان ہی دادا میاں کی محبت دل میں گھر کیے ہوئے تھی۔ سیّد عشرت حسین مع اہل و عیال کے تشریف لائے۔ خواجہ حسن نظامی دلّی سے پہنچے۔ عشرت منزل میں ہنگامہ تھا۔ میں جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ بستر پر غم کے آنسو بہاتا رہا۔ کچھ دنوں بعد عشرت حسین صاحب ملازمت پر تشریف لے گئے تو عشرت منزل سُونی ہو گئی۔ پھر کرایہ دار آ گئے۔ لیکن ان سے ہمارا کیا تعلق۔

حضرت اکبر کے متعلق بعض یادیں اب بھی تازہ ہیں۔ وہ طوطا یاد آتا ہے جس کے متعلق حضرتِ اکبر نے فرمایا تھا۔

حلیمن پکاریں کہ نیدھا بُوا
عجب جانور ہے یہ کاکاتوا
بتاؤ ذرا عقل ہے میری گم
کدھر اس کا سر ہے کدھر اسکی دُم

حلیمن اور نیدھا ملازم تھیں۔ اب ایسے ملازم کہاں! ان کی محبت یاد آتی ہے۔ حلیمن کھانا پکاتی نیدھا گھر کے دُوسرے کام کرتی۔ کبھی کوئی کھانا پسند آتا تو والد کے لیے بھیجتے۔ نیدھا خوان میں سرپوش سے ڈھانک کر لاتی۔ کہتی جج صاحب راجہ میاں کے لیے بھیجن ہیں۔ راجہ میاں میرے والد کا پیار کا نام تھا۔ کبھی دیکھتے کہ خوان لیے یہ کہتی چلی آرہی ہے آم آئے تھے۔ جج صاحب بچّن کے لیے بھیجن ہیں۔

ملازموں کے ذکر سے بندھو کا نام یاد آیا۔ یہ حضرت اکبر کے پاس اس وقت سے ملازم تھا جب یہ جمنا کے پل بننے کے سلسلے میں آٹھ رُوپے ماہوار پر ملازم تھے۔ دیکھیے روپے میں اس وقت کیا برکت تھی۔ آٹھ رُوپے ماہوار کی ملازمت اور علیحدہ ملازم! سنا ہے کہ ایک دن بندھو نے اصرار کیا کہ حضور میں آپ کی دعوت کرنی چاہتا ہُوں۔ حضرت اکبر نے قبول کیا۔ دُوسرے دن جب کھانا لے کر پہنچا تو دال روٹی سامنے رکھدی۔ حضرت اکبر نے پُوچھا کہ بھئی گھر سے آیا ہوا کھانا کہاں ہے وہ بھی لاؤ۔ دونوں کھانے ملا کر کھالوں گا۔ بندھو نے جواب دیا کہ حضور نے میری دعوت قبُول کی ہے۔ اب تو یہی کھانا کھانا پڑے گا۔ گھر کا کھانا تو میں نے کھا لیا۔ اس زمانے میں ملازموں کی محبت بھی ہوتی اور لحاظ بھی۔ حضرت اکبر نے وہی کھانا

کھایا اور اس واقعے کو سب سے ہنس ہنس کر بیان کرتے رہے۔

کن کن شفقتوں کا ذکر کروں اکثر بلا کر پاس بٹھاتے۔ ان کی بدولت بہت سی مشہور ہستیوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں پنڈت موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو کے مرتبے کے لوگ بھی تھے۔ کبھی کبھی عشرت منزل میں قوالی بھی ہوتی۔ اس میں حاضری ضروری ہوتی۔ ایک یا دو مرتبہ جانکی بائی کا گانا سننے کا بھی اتفاق ہوا۔ جانکی بائی متمنی رہتی کہ جج صاحب گانا سن لیں۔ بڑی مشہور گانے والی تھی لیکن صورت اس قدر مکروہ کہ خواب میں دیکھ لو تو رات بھر نیند نہ آئے۔ آواز میں وہ اعجاز کہ جو سُنے مسحور ہو جائے۔ اس وقت اس کے گانے کے ریکارڈ بہت مقبول تھے۔ اور ہر گھر میں ہوتے۔ بچپنے میں مجھے ایک ریکارڈ بہت پسند تھا۔ اس کا ایک ہی مصرع یاد رہ گیا۔ "بھک بھک بھک دھوئیں کی گاڑی اُڑائے لیے جائے"۔ باقی گیت کچھ اس مضمون کا تھا کہ ریل گاڑی مذہب و ملّت اور ذات پات کی پرواہ کیے بغیر ہندو، مسلمان، برہمن، چمار سب کو ساتھ ہی اڑائے لیے جاتی ہے۔ جانکی بائی کے گانے صرف مقبول گیتوں اور غزلوں کے نہ تھے۔ ٹھمری، دادرا اور راگنیاں سب کے ریکارڈ تھے۔ ہر ریکارڈ ایک ہی صدا پر ختم ہوتا "میرا نام جانکی بائی الہ آباد"۔ مشہور نام چھپن چھری تھا۔ سنتے تھے کہ جوانی میں کسی نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور چھپن زخم لگے تھے۔ اس سے صُورت مسخ ہو کر دہشت انگیز ہو گئی۔ شاعری بھی کرتی تھی اور اس کی آرزو تھی کہ حضرت اکبر اصلاح دیں۔ یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت اکبر تشریف لائے۔ کہنے لگے دیکھیے جانکی بائی

نے غزل اصلاح کے لیے بھیجی ہے۔ شاعری کا شوق اور نذر اور نظر کے تلفظ کا فرق نہیں جانتی۔ اب میں اس کو صحیح کیا کروں۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ گانے والی کی غزل میں صحیح زبان کی کس کو توقع ہو گی۔ آپ یوں ہی چھوڑ دیں۔

محبت اور عقیدت کے باوجود مجھے حضرت اکبر کے نظریات سے سخت اختلاف تھا۔ اپنے خیالات کے اظہار میں میں نے کبھی تامل نہ کیا۔ نہ وہ میری اس بے باکی پر کبھی ناراض ہوتے۔ مسکرا کر ٹال دیتے کہ بڑے ہو گے تو بات سمجھ میں آجائے گی۔ اِن کا ارشاد تھا۔

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی
عربی میں نظم ملت انگلش میں محض روٹی
لیکن جناب سید یہ قول سن کے بولے
بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے
کس کی نظر ہے غائر کس کی نظر ہے کھوٹی

میں انگریزی پڑھتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ انگریزی ہی پڑھنے سے ذہنی نشوونما ہو سکتی ہے۔ انگریزوں کے ساتھ سوشل برابری تو خواب میں بھی نہ آسکتی تھی لیکن علمی برابری کا متمنی ضرور تھا۔ سمجھتا تھا کہ دنیا کا سارا علم انگریزی ہی پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے اور جس نے انگریزی کی تحصیل کر لی وہ دُنیا کا افضل ترین انسان بن گیا۔ اس عمر میں میری نظر اس گہرائی تک کیسے پہنچتی کہ میکالے نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم اس لیے جاری نہیں کی تھی کہ کالا آدمی ذہنی اعتبار

سے انگریز کا مدّمقابل ہو جائے بلکہ اصل مقصد اس ذہنی اور معاشی غلامی کی بنیاد ڈالنا تھا۔ جس سے اس کی حکومت ختم ہونے پر بھی ذہنی آزادی نہ مل سکے اور غیر زبان سیکھنے کی کوشش میں پروازِ خیال کی بلندی محدود ہو جائے۔ سچ پوچھو تو اس تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ روٹی بھی انگریز کی نوکری سے میسّر آئے۔

اجسام کے فنون پہ کرتے ہیں خود عمل
اجرام کے علوم کا دیتے ہیں مجھ کو درس
ہوتا ہوں معترض تو وہ کہتے ہیں واہ واہ
ہم نے تو کر دیا ترا رتبہ بلند تر
از صحن خانہ تا بہ لب بام ازان من
وز بام خانہ تا بہ ثریا ازاں تو

حضرت اکبر عورتوں کی بے پردگی اور ان کو انگریزی پڑھانے کے سخت خلاف تھے۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

میں انگریز عورتوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔ ان میں ہر ممکن حسن و خوبی نظر آتی۔ دل چاہتا کہ ہماری عورتیں بھی ایسی ہی ہوں۔

میں سوچتا تھا کہ انسانی زندگی کی رونق انجمن سے ہے اور اس میں نسوانی چمک نہ ہو تو زندگی کا مزہ ہی کیا۔ یہ زندگی کا تجربہ ہی سکھاتا ہے کہ ایک مرتبہ اگر عورتیں شمع انجمن بن گئیں تو ان میں شہناز کے پیدا ہونے کو کوئی طاقت نہیں

روک سکتی اور جو سلسلہ شروع ہو گا وہ پھر قابو میں نہ آتے گا۔

حضرت اکبر نے تین شادیاں کیں۔ تینوں شیعوں میں۔ بیٹے کی شادی کی وہ بھی شیعوں میں۔ لیکن میں نے جس عمر میں ان کو دیکھا شیعیت سے بیزار پایا ایک دن مجھ کو بلا کر کہا کہ میں عقیل کے معاملے میں بہت متفکر ہوں۔ ان پر شیعوں کا بہت اثر ہے۔ ذرا ان کے خیالات معلوم کرو کہ کہیں شیعہ تو نہیں۔ میں نے آئیں بائیں شائیں کچھ جواب دیدیا۔ میرے والدین تو سنّی تھے لیکن شیعوں کے محلے میں رہتا تھا۔ شیعہ احباب کا ساتھ تھا۔ مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ ہمیشہ اپنے کو سنی کہا لیکن شیعہ سنی میں فرق نہ کر سکتا۔ جو مشن میرے سپرد کیا گیا تھا اس کو کس طرح انجام دیتا۔ میرا مسلک تو ہمیشہ یہ رہا۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ

چوں نہ دانند حقیقت رہ افسانہ زدند

حضرت اکبر کی تین شادیوں کے تذکرے سے اکثر لوگوں کو تعجب ہو گا عام طور پر دو شادیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ تیسری شادی کو شادی کا نام دینا بھی غلط ہے۔ بوٹا نامی ایک طوائف سے نکاح ہوا تھا۔ سنتے ہیں کہ مرتے وقت بوٹا نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں توبہ کر کے اور نکاح کر کے مرنا چاہتی ہوں۔ حضرت اکبر نے اس خواہش کا احترام کیا۔ بوٹا کی قبر خاندانی قبرستان میں حضرت اکبر کے مزار کے قریب ہی ہے اس قبر کی لوح پر حضرت اکبر کے کچھ اشعار بھی کندہ ہیں۔ لیکن خاندان والوں کو اس تذکرے سے شرم آتی ہے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس زمانے میں طوائفوں سے تعلق شرم

کی بات نہ تھی۔ بلکہ باعثِ فخر تھی۔ جس رئیس کے پاس طوائف ملازم نہ ہو وہ نہ رئیس تھا نہ شریف۔ ایک زمانہ تھا کہ شرفاء کے لڑکے تمیز اور تہذیب سیکھنے طوائفوں کے پاس بھیجے جاتے تھے اور بڑے متدین اور متشرع حضرات ان کے کوٹھوں پر آتے۔ یہ تو عہدِ وکٹوریہ کے اثرات تھے جو انگریزی تعلیم کے ساتھ ہندوستان میں پھیلے، اور جن کے تحت طوائفوں سے تعلق عیب سمجھا جانے لگا۔ کچھ معاشی وجہ بھی تھی۔ مسلمانوں کی ریاست غدر کی بدولت تباہ ہو چکی تھی۔ جو کچھ بچا کھچا تھا طوائفوں کے شوق میں بنیے کے پاس جا رہا تھا۔

رفت از باب زگا ہے خانمان دل برباد
خانہ خالی ماند و در ایں شعلہ صاحب خانہ سوخت

بزرگے دیدم اندر کوہسارے
قناعت کردہ از دنیا بغارے

خواجہ حسن نظامی ان بزرگوں میں نہ تھے جو دنیا کو چھوڑ کر پہاڑ کے کسی کونے میں چھپ جاتے ہیں۔ ان کے رسالے دین و دنیا کے سرورق پر جلی حرفوں میں لکھا ہوتا۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

درویش صفت، درویش سیرت، درویش صورت، گورا رنگ، بلند قامت لمبی داڑھی، لمبے بال، آنکھوں میں چمک اور جاذبیت، کلام میں شیرینی اور لطافت، طریقت نظامیہ کے علمبردار، صحافی، مصنف، مورخ اور تاجر دو لاکھ مریدوں کے پیر جن کو عبادت کے ساتھ محنت اور اکل حلال حاصل کرنے کی تلقین کرتے اور جہاں ان کے لیے دعائے خیر کرتے ان کی دنیاوی مشکلات رفع کرنے میں دامے درمے سخنے گریز نہ کرتے۔

سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ ہندوستان میں کونے کونے پھرے۔ سادھو کا بھیس اختیار کیا۔ اس طرح بنارس اور متھرا پہنچے۔ ہندو رشیوں کی روحانی کیفیت کی تحقیق کی۔ حج کو گئے اور مشرق وسطیٰ میں گھومے۔ اس کے حالات سفرنامے میں قلم بند کیے ہیں۔ غدر دہلی کے افسانے تاریخ نویسی کے اعجاز کا نمونہ ہیں۔

مضمون نگاری میں وہ طرز پیدا کیا جو کسی زبان میں نہیں ملتا۔

والدہ ان کی مرید تھیں۔ ہوش نہ سنبھالا تھا کہ انھوں نے بسم اللہ پڑھوائی۔ پھر برابر حاضر خدمت ہوتا رہا۔ پہلی مرتبہ اپنی تحریر ان ہی کے رسالے میں چھپی دیکھی۔ میں نے ان کو عورتوں کی آزادی کے متعلق ایک خط لکھا تھا۔ انھوں نے رسالے میں چھپوا دیا۔ حضرت اکبر کو ان سے اور ان کو حضرت اکبر سے بڑی محبت تھی۔ اور یہ حضرت اکبر کو اپنا مرشد کہا کرتے تھے۔ عشرت منزل میں ان کے لیے خاص کمرہ مخصوص تھا۔ کمرہ کیوں ہال کہیے۔ اکثر آتے اور کئی کئی دن گزارتے۔ میں ہر وقت حاضرِ خدمت رہتا۔ جب تک ان کے کاروبار نے فروغ نہ پایا تھا غالباً حضرت اکبر کچھ مالی مدد بھی کرتے تھے۔ الہ آباد آتے تو ان کے پاس پچاسوں مریدوں کا اژدہام رہتا باتیں کرتے تو ہر شخص کو یہ احساس ہوتا کہ خاص مجھ ہی سے خطاب ہے ہر ایک کے گھر کے حالات سے واقفیت، ہر ایک کے بچوں کے نام یاد۔ پرسش احوال کا یہ انداز کہ گویا کسی قریبی عزیز سے گھریلو معاملات پر گفتگو ہو رہی ہے۔

ایک دلچسپ واقعہ انھی کی زبانی سنا۔ نظام حیدر آباد سے پہلی مرتبہ ملاقات کی اجازت ملی۔ نظام وقت کے بڑے پابند تھے۔ یہ ارادتاً پندرہ منٹ دیر کر کے پہنچے۔ ملٹری سیکرٹری نے کہا آپ نے غضب کیا۔ اعلیٰ حضرت بہت برہم ہیں۔ پیشی ہوئی تو نظام نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا خواجہ صاحب! آپ کے وقت کی کوئی قیمت نہیں ہے تو یہ نہ سمجھیے کہ دوسروں کا وقت بھی قیمتی نہیں۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ اعلیٰ حضرت! میں تو وقت مقررہ سے پہلے ہی در دولت پر حاضر ہو گیا تھا۔ لیکن باغ میں مجھے پانی کی گاڑی نے آواز دی اور کہا تم بادشاہ کے حضور میں

جا رہے ہو۔ ٹھہرو اور میرا ایک پیغام لیتے جاؤ۔ میں کھڑا ہو گیا اور دیکھا کہ اتنی دیر میں وہ گاڑی تین مرتبہ بھری گئی اور تینوں مرتبہ اس کا پانی درختوں کی جڑوں میں پہنچایا گیا۔ گاڑی نے مجھ سے کہا تم نے دیکھا کہ جب میں خالی ہوتی ہوں تو پھر کس طرح بھر دی جاتی ہوں۔ اگر میں اپنا پانی درختوں تک نہ پہنچاتی تو ایک ہی مرتبہ بھری جا سکتی تھی۔ جو پانی مجھ میں بھرا ہوتا اس میں بدبُو پیدا ہو جاتی۔ بادشاہ سے کہہ دو یہی حال دولتِ دُنیا کا ہے۔ جو دوسروں پر خرچ کر دیتا ہے۔ اس کے خزانے اللہ اپنی قدرت سے بھرتا ہے اور جو جمع کیے رکھتا ہے وہ دنیا کی ملامت ساتھ لے کر خالی ہاتھ اللہ کے سامنے جاتا ہے۔ نظام کنجوسی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے سامنے ایسی گفتگو بڑی جرأت کا کام تھا۔ لیکن نصیحت کا انداز رنگ لایا۔ حُسنِ طلب بھی سمجھ گئے۔ حکم دیا کہ دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا جائے۔

میرے ماموں سید عبدالاحد جو بعد میں پاکستان میں اکاؤنٹنٹ جنرل مقرر ہُوئے۔ بسلسلۂ ملازمت دلّی میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ گرمیوں کی چھٹیاں ان کے پاس گزارنے گیا۔ برائے نام ماموں کے پاس رہتا۔ زیادہ وقت نظام الدین میں خواجہ صاحب کی خدمت میں گزارتا۔ پہلی مرتبہ گیا تو دیکھتا ہُوں دو منزلہ مکان ہے۔ اس میں نیچے سے اُوپر تک جلی حرُوف میں لوگوں کے نام لکھے ہیں۔ اوپر لکھا ہے "رفیقوں کے نام"۔ میں نے نام پڑھنے شرُوع کیے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا۔ اس میں ایک بڑی کمی ہے۔ تمہارے والد کا نام سہواً رہ گیا ہے۔ فوراً کاتب کو بلایا اور والد کا نام میرے بیٹھے بیٹھے لکھوایا۔ دالان میں چاندنی بچھی تھی۔ خواجہ صاحب گاؤ تکیہ لگائے ایک طرف بیٹھے تھے۔ سامنے ڈیسک تھی۔ مضمون نگاری

میں مصروف تھے۔ ڈیسک پر ایک بیرومیٹر بھی رکھا تھا۔ میں نے تعجب سے دیکھا۔ فرمایا تم کو ایک لطیفہ سنا دیں۔ ایک مرتبہ مرید بیٹھے تھے۔ باہر چونا پڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پارہ تیزی سے نیچے گر رہا ہے۔ ملازم کو آواز دی کہ چونا فوراً ہٹا لو بارش ہونے والی ہے۔ آسمان صاف تھا۔ سب کو تعجب ہوا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ سب نے اس کو کرامت پر محمول کیا اور ایک ایک نے اُٹھ کر میرا ہاتھ چُوما۔ میں ان کو کیا بتاتا کہ یہ کرامت میری نہیں اس آلے کی ہے۔

ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ان کی چھوٹی صاحبزادی رُوحہ آگئیں۔ تین یا چار برس کی عمر ہو گی۔ میں امتحان دے کر دلّی گیا تھا۔ رُوحہ بی بی سے میری کامیابی کے لیے دعا کرائی میں نے نذرانہ پیش کیا۔

اسی عرصے میں حضرت امیر خسروؒ کے عرس کی تاریخ آگئی۔ اس کی ہمہ ہمی یاد آتی ہے۔ مزار پر تو قوالی ہوتی ہی تھی۔ خواجہ صاحب کے گھر میں علیحدہ عُرس ہوتا اور اس میں جو مجمع ہوتا تھا وہ مزار کے عرس سے کم نہ تھا۔ خواجہ صاحب مزار کے مجاور نہ تھے۔ ان کی طرف معتقدین کے ہجوم سے مزار کے مجاورین کو بہت رشک تھا۔ اسی سلسلے میں ان پر ایک مرتبہ پستول سے حملہ بھی ہوا۔ جس کو اللہ رکھےّ اس کو کون چکھےّ۔ گولیاں موٹر خانے کے دروازے پر لگیں۔ اس کے نشان خواجہ صاحب نے محفوظ کر کے اس پر مناسب عبارت تحریر کی۔

خواجہ صاحب کے خاص رفیقوں سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ان میں بھیّا احسان الحق اور ملّا محمد واحدی خاص طور پر مہربان رہے۔ یہ دونوں دلّی کے رئیسوں میں تھے اور صحافت مشغلہ تھا۔ ملّا واحدی کا رسالہ نظام المشائخ سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ بھیّا احسان الحق نے بھی کئی رسالے نکالے اور اس پر بہت دولت ضائع کی۔ دلّی میں ان کی شان و شوکت دیکھنے کے بعد دونوں سے پاکستان میں ملتا رہا۔ جتنی مرتبہ ملا گردشِ آسمان کے کرشموں سے انگشت بدنداں رہا۔ دونوں کو یا تو محلوں میں دیکھا تھا یا اب جھونپڑوں میں عسرت کی زندگی بسر کرتے دیکھا۔ آخری مرتبہ ملاقات ہوئی تو بھیّا دمہ سے معذور، گرمی میں ٹین کی چھت کے نیچے لیٹے تھے۔ کچھ دنوں بعد وصال کی خبر ملی۔ واحدی صاحب لڑکے کے کوارٹر کے باہر ایک میز لگائے لکھنے میں مصروف تھے۔ بہرصورت دونوں انقلاب زمانہ کا مُرقّع تھے۔

خواجہ صاحب کا دستور تھا کہ سنیچر کو نظام الدّین سے دلّی چلے آتے۔ واحدی صاحب یا بھیّا کے مکان پر دعوت کا انتظام ہوتا۔ بہت سے احباب شریک ہوتے۔ کھانے کے بعد قوالی ہوتی۔ ایک مرتبہ کسی طوائف کا گانا بھی سُنا۔ یہیں دلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی سے داستان سُنی۔ واحدی صاحب نے دیکھا کہ میں داستان گو کی فصاحت و بلاغت، نکتہ سنجی اور طرزِ بیان سے مسحُور ہوں۔ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ کوئی عالم یا فلسفی ہیں باپ دادا سے سُن سُن کر زبانی یاد کر لیا ہے۔ ورنہ ان کو تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔

داستان ناول اور افسانے سے ملتی جلتی لیکن مختلف چیز تھی۔ افسوس کہ انگریزوں کی نقل کی کوشش نے اس فن لطیفہ کو مٹا دیا۔ اگر اس کی ترقی ہوتی

تو ادب میں اس کا بلند مقام ہو سکتا تھا اور یہ نقل نہ ہوتی ہماری اپنی چیز ہوتی۔

قوالی کے بعد صرف خاص خاص احباب رہ جاتے۔ خواجہ صاحب کچھ دیر تاش کھیلتے۔ پھر تہجد کی نماز ادا کر کے کچھ دیر آرام فرماتے۔ فجر کی نماز کے بعد پُر تکلف ناشتہ ہوتا اور مریدوں کی آمد شروع ہو جاتی۔

مقربین خاص میں جمالی صاحب اور غزالی صاحب تھے۔ دونوں نو عمر دونوں اسم بامسمیٰ۔ ایک کے پاس پانوں کا ڈبہ ہوتا۔ دوسرے کے پاس ڈلی اور تمباکو کا بٹوہ۔ ایک اپنے ہاتھوں سے منہ میں پان کا بیڑہ رکھتے۔ دوسرے ڈلی اور تمباکو پیش کرتے۔

خواجہ صاحب مقربین کو خطاب دیا کرتے تھے اور ان کے حلقے میں ہر شخص اصل نام کے بجائے اس خطاب سے پکارا جاتا تھا۔ غزالی اور جمالی ان ہی کے تجویز کردہ خطابات تھے۔ میرے لیے کئی شاعرانہ خطاب تجویز کیے۔ مجھے پسند نہ آئے۔ آخر بھیا کی سفارش پر میرا وہی خطاب رہا جو پہلے تخلص تھا۔ اس کے بعد میں خواجہ صاحب کے معتقدوں کے حلقے میں ہمیشہ وجدی کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔

میری بے باکی بدتمیزی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ایک دن عرض کیا کہ آپ کا روزنامچہ اپنی اور اپنے بچوں کی تعریفوں سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ مکروہ ہے۔ فرمایا کہ بچے ہو بعد میں عقل آئے گی کہ اگر تم نے خود اپنی تعریف نہ کی تو دوسروں کو کیا غرض ہے کہ تمہاری تعریف کریں۔

جہاں خواجہ صاحب کے معتقدین لاکھوں تک پہنچتے تھے وہاں دشمنوں

کی بھی کمی نہ تھی۔ ان پر حملہ کا تذکرہ ہو ہی چکا ہے۔ ایک صاحب ان کے خلاف رسالے بھی نکالتے تھے۔ خواجہ صاحب کے رسالے کا نام "منادی" تھا۔ اس کے جواب میں "سُنادی" اور "اڑادی" رسالے نکالے گئے جن میں ان کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ دیوان سنگھ مفتوں کے اخبار "ریاست" میں بھی ان پر رکیک حملے ہوتے تھے۔ دشمنی کی کچھ وجہ تو خاندانی جھگڑا تھا جس کا تذکرہ کر چکا ہوں اور کچھ ان کی تبلیغی سرگرمیاں جس کی وجہ سے ہندو ان کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔

خواجہ صاحب کو شاہانِ مغلیہ کے پس ماندگان سے بے انتہا ہمدردی تھی۔ ایک دن حاضر خدمت تھا۔ ملازم کو آواز دی۔ "سہراب" وضو کے لیے پانی رکھو۔ ایک شخص جس کے چہرے سے شاہی خاندان سے وابستگی کا شک بھی نہ ہو سکتا تھا لوٹے میں پانی لے کر حاضر ہوا۔ اس کے نام پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ فرمایا کہ اس کو دیکھو اور انقلاب زمانہ کی نیرنگیوں سے عبرت حاصل کرو۔ اگر ۱۸۵۷ء میں انقلاب نہ ہوتا تو یہ ایک معزز اور صاحب اقتدار شہزادہ ہوتا۔ آج یہ میری خدمت کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔

جس زمانے میں مَیں دلی میں ڈویژنل اکاؤنٹس افسر تھا ایک دن دفتر میں ٹیلیفون آیا کہ بہادر شاہ کا پڑپوتا بھوکوں مر رہا ہے۔ اس نے بجلی کا کام سیکھا ہے۔ اس کی مدد کرو۔ میرا اثر اور میرا اختیار محدود تھا۔ عرض کی کہ وعدہ نہیں کرتا۔ لیکن کل صبح میرے دفتر بھیج دیجیے۔ دوسرے دن وہ دفتر آیا۔ اتفاق سے جس وقت اس کے آنے کی اطلاع ملی۔ انگریز ڈویژنل ٹکنیکل انجینئر میرے کمرے میں موجود تھے

میں نے ان سے پوچھا کہ بہادر شاہ کے پرپوتے سے ملو گے۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں کے تباہ کرنے میں تو کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ لیکن طبعاً یہ شاہ پرست ہوتے ہیں۔ صاحب بہادر نے گھبرا کر کہا کہ میری یہ قسمت کہاں کہ یہ عزت حاصل ہو۔ میں نے کہا کہ اس وقت وہ میرے چپراسی کے ساتھ بیٹھے ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ مجھے فرصت ہو تو دو منٹ کے لیے ان سے مل لوں اور ہو سکے تو ملازمت حاصل کرنے میں مدد کر دوں۔ یہ میرے اختیار سے باہر ہے تم مدد کر سکتے ہو۔ صاحب میری منت کرنے لگے کہ فوراً ان سے ملاقات کرائی جائے میں نے بلایا صاحب بہادر کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور انتہائی تعظیم سے ملے۔ اس وقت تک خود نہ بیٹھے جب تک ان کو کرسی پر نہ بٹھا لیا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد ساتھ لے گئے اور فوراً ایک اچھی جگہ پر ملازم کرا دیا۔ ان کی مدد سے انھوں نے بعد میں کافی ترقی کی۔

حضرت اکبر نے فرمایا تھا۔

حضرت ابو ہریرہ سے بلّی نہ چھُٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلّی نہ چھُٹ سکی

یہ شعر اس زمانے کا ہے جب حضرت اکبر چاہتے تھے کہ خواجہ صاحب الہ آباد آ کر قیام فرمائیں۔ لیکن خواجہ صاحب نے واقعی مرتے دم تک دلّی نہ چھوڑی۔ ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا۔ دلّی مسلمانوں سے خالی ہو گئی۔ ان کے بیٹے علی نظامی اور بیشتر اعزہ اور ساتھی پاکستان ہجرت کر گئے۔ لیکن خواجہ صاحب مرتے دم تک نہ ہلے۔ چند دنوں بعد حیدرآباد میں پناہ لی پھر واپس آ کر اپنی جگہ پر جم گئے۔

خواجہ صاحب پاکستان کئی مرتبہ آئے۔ پہلی مرتبہ تشریف لائے تو فرمایا کہ مجھے امریکن سفیر سے ملنا ہے اور مترجم کی ضرورت ہے تم ساتھ چلو۔ میں دفتر سے رخصت لے کر حاضر ہوا۔ اس دن کی گفتگو سے مجھے تعجب بھی ہوا۔ اور بہت سے خیالات بھی بدل گئے۔ مختصراً انھوں نے کہا کہ میں انگریزی سرکار کے لیے ہندستان میں ہمیشہ پروپیگنڈہ کرتا رہا اور سرکارِ برطانیہ کے لیے بہت سے اہم کام کیے ہیں۔ آپ چاہیں تو میں امریکن گورنمنٹ کے لیے پاکستان یا ہندوستان میں پروپیگنڈہ کے لیے موجود ہوں۔ سفیر صاحب سنتے رہے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس قسم کا کام میرے سپرد نہیں ہے۔

چودھری نذیر احمد صاحب نے اپنی وزارت کے زمانے میں کراچی میں بزمِ اکبر کی بنیاد ڈالی۔ حضرت اکبر کے پوتے سید محمد مسلم رضوی جوائنٹ سیکرٹری بنے۔ مجھے سیکرٹری مقرر کیا۔ بھیّا احسان الحق، ملا واحدی اور کچھ دوسرے دوستوں سے حضرت اکبر پر کتابیں لکھوائیں۔ خواجہ صاحب کو بھی ایک جلسے میں مدعو کیا۔ اور ان سے درخواست کی کہ حضرت اکبر کے متعلق جو یاد ہو لکھیں۔ خواجہ صاحب نے گرمجوشی سے وعدہ کیا۔ لیکن کہا کہ کاتب کا انتظام ضروری ہے۔ میں نے ایک ہزار روپے اس کام کے لیے پیش کیے۔ افسوس کہ خواجہ صاحب بزم کے لیے کچھ نہ لکھ سکے۔

بیاد خونِ جوانانِ جنگ جو جامی
زدیم بادہ و آواز نوش نوش آمد

چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں آئے دن لڑائیاں ہوتیں۔ ہولی میں کسی مسلمان پر رنگ پڑ گیا۔ شہر میں بلوہ ہو گیا۔ مسجد کے سامنے ہندو باجا بجاتے نکل گئے لڑائی ہو گئی۔ خبر پھیلی کہ مسلمان کہیں گاتے کی قربانی کرنے والے ہیں ہندو بپھر گئے اور مفت میں جانیں ضائع ہو گئیں۔ لیکن پس منظر مسلمانوں کی ہندوستان پر ایک ہزار سال کی حکومت تھی۔ ہندو اپنی غلامی کا بدلہ لینا چاہتے اور اس احساس کمتری کا ازالہ کرنا چاہتے جو اس دور کی یاد سے وابستہ ہے۔ مسلمانوں کو یہ زعم تھا کہ اس ملک کے حاکم ہمیشہ ہم رہے اور انگریز راستے سے ہٹ گئے تو پھر ہم ہی حاکم ہوں گے۔ ہندو ہمارے مقابلے کی تاب کہاں لا سکتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی تھی۔ اس وقت ان میں مسلمانوں کے مقابلے کی تاب نہ تھی۔

کانگریس اور خلافت کی تحریکیں شروع ہوئیں تو کچھ دنوں ہندو مسلمان کی جے کے نعرے لگتے رہے۔ لیکن ان تحریکوں کے ختم ہوتے ہی خواجہ حسن نظامی نے تبلیغ کی تحریک شروع کی۔ جس کا مقصد ہندوؤں کو مسلمان کرنا تھا۔ سوامی شرادھانند نے شدھی تحریک چلائی جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا۔ اور ساتھ ہی تحریک سنگھٹن شروع ہوئی کہ ہندوؤں میں لڑنے کی قابلیت پیدا ہو

سنتے تھے کہ یہ تحریکیں انگریزی سرکار نے شروع کرائی تھیں تاکہ ہندو مسلم اتحاد فروغ نہ پا سکے۔ ہر محلہ میں گلی گلی اکھاڑے بنے جہاں کشتی اور بنوٹ کی تعلیم دی جانے لگی۔ ویسے تو الہ آباد کے قصائی اور کنجڑے ہی ساری ہندو آبادی سے نپٹنے کے لیے کافی تھے لیکن اس تحریک کا ردعمل مسلمانوں پر بھی وسیع پیمانے پر ہوا اور پڑھے لکھے لوگ بھی لاٹھی چلانے کی مشق کرنے لگے۔ میں نے بھی یہ ہنر سیکھا اس میں کافی مہارت حاصل کی۔ گو کبھی استعمال کرنے کی نوبت نہ آئی۔

مسلمانوں کی آبادی الہ آباد میں دس فیصدی سے زیادہ نہ تھی لیکن جب لڑائی ہوتی وہ نوّے فیصد ہندوؤں پر بھاری رہتے۔ ۱۹۱۷ء کا دسہرا تھا ہندو جامع مسجد کے سامنے باجا بجاتے نکلے۔ مسلمان برہم ہو کر مسجد سے نکلنے لگے تو ایک سکھ سوار نے ایک نمازی کو نیزہ سے شہید کر دیا۔ پھر کیا تھا سارے شہر میں آگ لگ گئی۔ پچاس یا ساٹھ ہندو مارے گئے۔ ہندوؤں کی دکانیں لٹ گئیں۔ پولیس بے بس ہو گئی۔ شہر میں گورا فوج طلب ہوئی اس وقت امن ہوا۔

الہ آباد میں اترسیّا کی سڑک دو میل لمبی لیکن مشکل سے دس یا بارہ فٹ چوڑی ہے۔ دونوں طرف ہندوؤں کے اونچے مکان۔ کسی مسلمان کا اس سڑک پر نام نہیں۔ کسی مہاجن کے گھر اولاد نہ ہوتی تھی۔ اس نے منت مانی کہ اگر بیٹا ہوا تو مسجد بنواؤں گا۔ خدا کو منظور تھا۔ منّت پوری ہوئی۔ اس نے اپنے مکان کا ایک حصہ توڑ کر مسجد تعمیر کرا دی۔ اس میں پندرہ بیس آدمیوں سے زیادہ نہ آسکتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں تحریک سنگھٹن کا شباب تھا۔ دسہرے کا سارا جلوس اسی مسجد کے سامنے سے گزرتا تھا۔ مسلمان باجا مسجد کے سامنے بجنے پر ہمیشہ لڑنے پر آمادہ

رہتے۔ کلکٹر نے حکم دیا کہ نماز مغرب کے وقت باجا نہ بجے۔ پندرہ یا سولہ مسلمان مسجد میں جمع تھے۔ پولیس نے باہر سے تالا لگا دیا۔ اس سال یہ دسہرے کا جلوس نہ تھا۔ فوج کی پریڈ تھی۔ ہاتھی اور گھوڑے تو ہمیشہ اس جلوس میں ہوتے۔ اس سال سارے شرکا، تلوار، گرز اور نیزوں سے مسلح تھے۔ ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا۔

اس فوج میں ایک ایک نمودار جوان تھا
تھا پیل دماں کوئی، کوئی شیر ژیان تھا
دیکھا جسے تو لے ہوئے اک گرز گران تھا
ہر شخص کے اسپ دورکابہ تہہ ران تھا
ٹاپوں سے قدم کانپتے تھے گاؤ زمیں کے
غل نعروں کا جاتا تھا پرے چرخ بریں کے

حسب الحکم صاحب کلکٹر بہادر مغرب کے وقت باجا بند ہوا۔ کچھ دیر جلوس خاموشی سے گزرتا رہا۔ لیکن مسجد کے سامنے ایک شخص نے ایکبارگی تاشا بجانا شروع کر دیا۔ مسجد سے اللہ اکبر کی آواز آئی۔ ایک آدمی لاٹھی لیئے دیوار پر سے کودا اور ایک ہی وار میں تاشے والے کا کام تمام کر دیا۔ باقی پندرہ یا سولہ مسلمان بھی کود آئے اور لڑائی شروع کر دی۔ ہاتھی اور گھوڑوں پر سوار تلواروں سے مسلح لشکر۔

عناں را بہ پیچند و بر کاشت رُوئے
برآمد ز لشکر یکے ہائے و ہُوئے

سینکڑوں مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ وہی لوگ جو تلواریں لہرا لہرا کر

جے جے کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہتھیار پھینک کر ایک دُوسرے کو کچلتے ہوتے
بھاگے۔ مسلمان لڑائی کے لیے تیار نہ تھے۔ ہنستے سڑک کے کنارے یا ہندوؤں
کی دکانوں سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اطمینان سے وہ ہتھیار جمع کیے۔
میں بھی ایک ہندو دکان پر کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ہندُو خُود سے تلوار
مسلمانوں کے حوالے کر کے ان کے پیر پکڑتے کہ ہمیں بھاگ جانے دو۔ تھوڑی ہی
دیر میں سناٹے کا عالم ہوگیا۔ میں اپنے بھائی کو اتر سیّا کے دُوسرے کنارے ایک
مسلمان کے گھر میں جلوس دیکھنے کو پہنچا آیا تھا۔ پریشان تھا کہ کس طرح واپس لاؤں
محلے والوں نے ہمت دلائی پچیس یا تیس آدمی نکل کھڑے ہُوئے۔ سر پر رومال بندھا
ہوا۔ تہمد کس کر لپیٹی ہوئی۔ گھیرے میں لے کر دو میل گئے اور واپس لائے راستے
میں کسی کے چوں کرنے کی بھی آواز نہ آئی۔

بجرم عشق توام می کشند و غوغا ایست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ایست

مرزا محمد اکبر اور بینی بہادر ماتھر اسکول میں میرے ساتھ تھے۔ دونوں عزیز دوست۔ دونوں ریلوے میں ملازم ہوئے۔ اکبر صاحب پاکستان آکر ہیڈ ٹرین ایگزامینر کے عہدے سے ریٹائر ہوتے۔ ماتھر صاحب انڈین ریلوے بورڈ کے ممبر ہوئے اور بعد میں کسی بڑے کارخانے کے مینجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اکبر صاحب مشہور کرکٹ کھیلنے والوں میں تھے۔ لیکن ہر وقت لڑنے کو تیار۔ ماتھر صاحب خاموش طبیعت۔ سوا کتابوں کے کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ ایک مرتبہ ہندو مسلم فساد کے موقع پر اکبر صاحب مسلمانوں کی ٹولی کے کپتان بن کر ہندوؤں کے محلے پر حملہ کرنے نکلے، عمر چودہ پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ہندو پہلوان مقابلے پر آتے۔

ہمہ گرز داران و مردان مرد
ہمہ شیر مردان روز نبرد

ان میں سے ایک نے ڈنڈے سے وار کیا۔ اکبر صاحب نے پینترا بدلا وار خالی گیا۔ اور ان کی چھری پسلیوں سے گزر کر اس کے دل میں پیوست ہوگئی۔ پہلوان وہیں ڈھیر ہوگیا

بداں زور بازوئے آں شیر دل
برزمے جہاں کرد پر خون و گل

لڑائی ماتھر صاحب کے گھر کے سامنے ہوئی تھی۔ یہ کوٹھے کی کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔ پولیس پہنچی تو انھوں نے اکبر صاحب کا نام لکھایا۔ مسلمان لڑبھڑ کر فتح یاب واپس ہوئے۔ لیکن اکبر صاحب پر خوف طاری تھا۔ پولیس تلاش میں تھی۔ یہ اپنا گھر چھوڑ کر چچا کے گھر تہہ خانے میں روپوش ہو گئے۔ ہفتہ بھر کے بعد ان کے چچا مجھے بلانے آئے۔ دیکھا کہ رنگ زرد ہے۔ چھ مہینے کے بیمار معلوم ہوتے ہیں۔ کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ ایسی لڑائیوں میں ثبوت کہاں ملتا ہے مقدمہ فائل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ گھر سے نکلے اور اسکول آنا شروع کیا۔ لیکن اب بدل چکے تھے۔ نہ وہ نخوت نہ وہ تند مزاجی۔ سلامت روی سے پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی کا نتیجہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا۔ مسلمان کبھی دبے نہیں۔ ان کا خوف ہمیشہ ہندوؤں پر طاری رہتا۔ اگر پانچ مُسلمان مارے جاتے تو یہ دس ہندوؤں کو قتل کرتے۔ آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں الہ آباد جانا ہوا۔ ان ہی شیروں کو بھیڑوں میں بدلا ہوا پایا۔ گرمیوں کا زمانہ کوٹھڑیوں کے دروازے بند کیے بیٹھے تھے۔ یہ ہمت نہیں تھی کہ سڑک پر نکل بیٹھیں۔ ان کے چہروں پر مایوسی تھی اور آنکھوں سے خوف ٹپکتا تھا جن نواب

یار تیس یا انگریزیت پسند لیڈروں پر انھوں نے بھروسہ کیا تھا وہ انھیں چھوڑ کر پاکستان میں حاکم بننے کو چلے آئے تھے۔ پہلے شہر میں دو ایک مُسلمان افسر ضرور ہوتے جن سے ان کو ڈھارس رہتی۔ وہ بھی پاکستان پہنچ چکے تھے۔ کچھ خوش حال تاجر تھے۔ جب پکڑ دھکڑ ہوتی تو یہ ان کے بچوں کی دیکھ بھال کرتے۔ ان میں سے اکثر صنعت کار بننے یا بلامقابلہ تجارت کا فائدہ اُٹھانے کے لیے پاکستان چلے گئے تھے۔ غریبوں کے لیے پاکستان کے دروازے بند تھے۔ بے سہارا اور بے افسر فوج رہ گئی تھی۔ اب ہمت اور حوصلہ کہاں سے آتا ان کی حالتِ زار دیکھ کر دل کہتا۔

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری
وز نفاق تیر و قصد ماہ و کید مشتری

یاد بھولی ہوئی پھر ایک کہانی آئی
دِل ہُوا خوُن طبیعت میں رُوانی آئی

رات آکاش وانی پر مسز وجے لکشمی پنڈت کی آواز سُنی۔ وہ زمانہ یاد آیا جب ہم ان کا "تماشائے بہ یک کف بردن صد دل" دیکھنے کانگرس کے جلسوں میں جایا کرتے اور دل کو یہ کہہ کر سمجھاتے۔

من کیستم کہ خواہم درپہلوش نشینم
ایں بس مرا کہ بینم از دور گاہ گاہے

مسز پنڈت نے فرمایا کہ میری عمر ستّر برس کی ہو چکی ہے۔ لیکن آواز کا ترنّم، لہجہ کی لطافت اور دل کشی، طرزِ بیان کی سادگی اور شرمیلا انداز سترہ برس کی عُمر کا تھا۔

مسز پنڈت کی آواز سُن کر الہ آباد کے مشہُور بزرگ علامہ حکیم احمد حُسین عُثمانی مترجم تاریخ ابن خلدون کی یاد تازہ ہُوئی۔ ان کے بیٹے محمّد میاں میرے خاص دوستوں میں تھے۔ حکمت بھی کرتے اور ایک چھاپہ خانہ بھی چلاتے۔ ان کی قابلیت، اخلاق اور مزاج کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ افسوس کہ جوانی میں ہی انتقال فرما گئے۔ ایک دن ان کے پاس پریس میں بیٹھا تھا کہ بڑے حکیم صاحب تشریف لائے۔ چہرے سے غصے کے آثار نمایاں تھے۔ ہم دونوں گھرا کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا کہ تم نے کوئی مثنوی چھاپی ہے۔ پنڈت موتی لال سے

ہمارے پُرانے مراسم ہیں۔ انھیں شکایت ہے کہ ہم نے ان کے گھرانے کی عزّت کا خیال نہیں رکھا۔ محمد میاں یہ مثنوی مجھے دکھا چکے تھے۔ بڑے حکیم صاحب نے ساری کاپیاں منگوائیں اور اپنے سامنے آگ لگوادی پھر یہ فرما کر چلے گئے کہ آئندہ سے باپ کے دوستوں کی عزت کو اپنی عزت سمجھو۔ قصّہ یہ تھا۔

یکے را چو من دل بدست کسے
گرد بود ومی برد خواری بسے

پہلی تحریک کانگرس میں انڈی پنڈنٹ نامی ایک نیا انگریزی پرچہ نکلا جس کے زورِ قلم اور آزادیٔ خیال نے ہندوستان کے سارے اخباروں کو ماند کر دیا۔ سیّد حسین مرحوم جو اس وقت جواں سال تھے اس کے ایڈیٹر ہو کر آتے۔ اخبار آنند بھون سے نکلتا تھا۔ یہ پنڈت موتی لال نہرو کا قدیمی مکان تھا یہیں سید حسین رہتے تھے۔ جہاں انھوں نے جرأت نگاری اور زورِ تخیل سے ملک پر اپنا سکّہ بٹھالیا تھا۔ وہیں شکل وصورت اور وجاہت کے لیے بھی مشہور تھے پنڈت جی کی آزاد خیالی اور ان کا مسلمانوں سے اُنس مشہور تھا۔ سیّد حسین ان کے گھر کے فرد بن گئے۔ ساتھ ہی وجے لکشمی رہتی تھیں۔ "پری پیکر نگارے سروقد لالہ رخسارے" جہاں آگ اور بارُود جمع ہوں شعلے بھڑک اٹھنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ دونوں کے دل میں شادی کی خواہش پیدا ہوتی۔ لیکن سماج اس قسم کی شادی کی کب اجازت دیتی تھی۔ دونوں خاموشی سے دلّی گئے۔ وہاں سے بمبئی پہنچے یہاں مسلمان قائدین نے ہمّت افزائی کی۔ آزاد سبحانی نے نکاح پڑھایا۔ خبر بجلی کی طرح سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اور ہندو مشتعل ہو گئے۔ سُنا تھا کہ جواہر لال نہرو

نے باوجود اپنی مثالی آزاد خیالی کے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ ہندو لیڈر بھاگے گئے اور دونوں کو زبردستی الہ آباد لاتے۔ یہاں سید حسین سے طلاق نامہ لکھوایا گیا۔ اور یہ وعدہ لیا کہ وہ ہندوستان میں نہ رہیں گے۔ اس کارروائی میں گاندھی جی پیش پیش تھے سید حسین امریکہ چلے گئے اور وہاں ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ جس میں کانگرس کے نقطۂ نظر کی تبلیغ کرتے رہے۔

خبر دہید بہ صیاد ما کہ ما رفتیم
بفکر صید دگر باشد و شکار دگر

یہاں تک تو اس مثنوی کی داستان تھی جس کو جلتے دیکھا تھا۔ باقی بعد کا سنا سنایا قصہ یہ ہے کہ گاندھی جی نے اپنے اثر سے وجے لکشمی کی شادی مسٹر پنڈت سے کرا دی جو بظاہر بہت کامیاب رہی۔ سید حسین نے عمر بھر شادی نہ کی۔ نیویارک میں اکیلے رہتے رہے اور زبانِ حال سے کہتے۔

دل از درد جدائی می کشد آہے و می گوید
کہ تنہائی عجب دردیست داد از درد تنہائی

آخر وہ وقت بھی آیا کہ ہندوستان آزاد ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کے وزیر اعظم بنے اور مسز پنڈت جو بیوہ ہو چکی تھیں۔ امریکہ میں ہندوستان کی سفیر بن کر تشریف لے گئیں۔ اس زمانے کے متعلق سنا ہے کہ سفیر صاحبہ اپنے ہاتھوں سے سید حسین صاحب کو کھانا پکا کر کھلاتیں اور ان کی لڑکیاں ان کے کمرے کو پھولوں سے آراستہ رکھتیں۔

ہجرے بسالہاتے فراداں کشیدہ ام
وصلے بطول مدت ہجرانم آرزدست

فلک ایسی آرزوئیں کہاں پوری ہونے دیتا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد سیّد حسین مصر میں سفیر بنا کر بھیج دیئے گئے وہاں ان کی صحت خراب ہُوئی۔ پنڈت نہرو کی ذاتی درخواست پر ہندوستان واپس آئے اور آبائی وطن پٹنہ میں انتقال فرمایا۔ سُنا ہے کہ اس وقت مسز پنڈت موجود تھیں۔ اور ان ہی کی گود میں دم توڑا

ہائے کس وقت ہوئیں دونوں مرادیں پوری
یار بالیں پہ جو آیا تو قضا بھی آئی

مسز پنڈت نے اس برّصغیر سے انگریزوں کو نکالنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر اُس شخص کے دل میں ان کی بے حد عزّت اور محبّت ہے جو اس جنگ میں براہِ راست یا بالواسطہ شریک تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک اہم بین الاقوامی شخصیت ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی پر قلم اُٹھانے کی جسارت صرف اس لیے ہُوئی کہ اتنی بلند شخصیتوں کے ذاتی واقعات قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتے ہیں۔ ان کے نکاح اور طلاق سے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہونا شروع ہوا۔ ایک طرف تو مسلمان اور ہندو قائدین میں ذاتی رنجشیں پیدا ہوگئیں۔ دُوسری طرف عوام کے ردِّ عمل نے ہیجانی کیفیت اختیار کرنی شرُوع کی۔ گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو خاص طور پر مسلمانوں کی تنقید کا نشانہ بنے۔ یہ ہندو مُسلم اتحاد کے خاص طور پر علم بردار تھے۔ جب ان ہی

کے دل اس قدر تنگ نکلے تو دُوسرے ہندوؤں سے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ آزادی کے بعد ان کی مسلمانوں سے ہمدردی ان مظلوموں کے کام آئی جن سے ہم جھوٹے وعدے کر کے بے یار و مددگار ہندوستان میں یہ کہہ کر چھوڑ آئے تھے کہ مسلمانانِ ہند، ہندوستانی ہیں۔ اور ہمیں ان سے اب کوئی واسطہ نہیں ہے۔

دل تنگ، دست تنگ، جہاں تنگ کار تنگ
از چار سُو گرفتہ مرا روزگار تنگ

دسویں درجے تک ہی پہنچا تھا کہ والد کی پنشن ہو گئی۔ گو بھائی صاحب ملازم ہو چکے تھے۔ لیکن خرچ کی تنگی پریشان کن تھی۔ والدین کا اصرار ہُوا کہ اب میں ملازمت کروں اور ان پر بار کم ہو۔ مجبُوری تھی۔ تعلیم کے اخراجات کہاں سے پُورے کرتے۔ شوقِ تعلیم دل میں لیکن حالات نامساعد۔ قہر درویش برجان درویش۔ تعلیم ختم کرنے پر راضی ہُوا اور تلاش معاش شروع کی۔ خوش قسمت تھا۔ تار گھر میں کلرک کی جگہ مل گئی۔ تیس روپے ماہوار تنخواہ۔ سخت زندگی۔ ڈیوٹی ہر ہفتہ بدلتی رہتی۔ کبھی آٹھ بجے سے دو بجے رات تک، کبھی دو بجے رات سے آٹھ بجے صبح تک۔ کبھی آٹھ بجے صبح سے چار بجے شام تک۔ کبھی چار بجے شام سے بارہ بجے رات تک۔ نہ کھانے کا وقت مقرر نہ سونے کے اوقات کی پابندی، کام کی وہ کثرت کہ سر اُٹھانے کی مہلت نہیں۔ تاروں پر ٹکٹ لگانا، نمبر لگانا اور ایک ڈسک سے دوسرے ڈیسک تک پہنچانا۔ ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ جو کبھی ختم نہ ہوتا تھا۔ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ پھر بھی تکان اس قدر ہوتی کہ سولہ یا اٹھارہ گھنٹے جو فرصت کے ملتے نہ نیند پوری کرنے کو کافی تھے نہ ان میں تھکاوٹ رفع ہوتی۔ کلرک کی زندگی کی سختی مَیں کبھی نہیں بھُولا۔ مدتوں بعد۔ پاکستان میں اسی محکمہ میں بہت اعلیٰ عہدے پر پہنچا۔ بحیثیت فائننشل ایڈوائزر تنخواہیں اور ملازمت کی شرائط بڑی

حد تک میرے ذمّے تھیں۔ مجھے کلرکوں اور دُوسرے کم تنخواہ پانے والوں سے بڑی ہمدردی رہی۔ لیکن حکومت کی مجبوریاں کچھ ایسی ہیں کہ باوجود ہمدردی کے زبانی جمع خرچ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ تنخواہ کے معاملے میں پے کمیشن کی سفارشات سے آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ کچھ اور مراعات تجویز کیں۔ خرچ اتنا نکلا کہ وزیر خزانہ سے سننا پڑا کہ تم ایک ہی طبقہ پر ملک کا سارا خزانہ لٹانے کے درپے ہو۔

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب مگر
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت سو بنائے نہ بنی

ایں دلِ غم دیدہ حالش بہ شود دل بد مکن
ویں سرِ شوریدہ باز آید بہ سامان غم مخور

میں تو صبر کر چکا تھا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ خلاف توقع اور خلاف امید کالج میں وظیفہ مل گیا۔ اس سے دبے ہوئے ولولے پھر جوش میں آئے والدین کی مرضی کے خلاف ملازمت سے مستعفی ہو گیا اور کالج میں داخلہ کرا لیا۔ لیکن محض اس وظیفہ سے اور اس قلیل رقم سے جو ملازمت کے عرصے میں پس انداز کی تھی کتنے دن گزارا ہوتا۔ الہ آباد میں محمد بخش پانی والے مشہور تاجر تھے۔ جامع مسجد کے نیچے ان کا کارخانہ تھا۔ یہاں سوڈا اور لیمنڈ کی بوتلیں بھری جاتیں محمد بخش صاحب بوہرہ تھے کاروبار میں ہوشیار لیکن انگریزی سے ناواقف اور خط و کتابت انگریزی میں ہوتی۔ کسی سے معلوم ہوا کہ ان کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس خط و کتابت میں ان کی مدد کر سکے ۔ حاضر خدمت ہوا۔ انھوں نے فوراً ملازم رکھ لیا۔ پانچ روپے ماہوار تنخواہ اور ایک گھنٹے کی ملازمت۔ دھیرے دھیرے میں نے ان کا بہت سا کام سنبھال لیا۔ جوں جوں کام سنبھالا وہ تنخواہ بڑھاتے رہے پانچ سے ساڑھے سات، ساڑھے سات سے دس اور پھر جب حساب لکھنے میں مدد دینی شروع کی تو بیس روپے تنخواہ کر دی۔ یہ نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ اب سرکاری ملازمت کی ضرورت نہ رہی۔ اور اطمینان سے تعلیم جاری رکھنے کا موقعہ مل گیا۔ محمد بخش صاحب تند مزاج بھی تھے اور سخت گیر بھی، ان کا

کام کرنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی چھ سال نبھاتا رہا۔

زاعزاز کسے ممنون نیم من گوہرم گوہر
نہد منت بخود ہر کس مرا از خاک بردارد

در بیاباں طلب گرچہ بہ ہر سُو خطر لیست
مے رود حافظ بے خود بتولائے تو خوش

اللہ اللہ کرکے انٹرنس پاس ہوا۔ پھر انٹرمیجیٹ۔ یہ وہ دشوار گزار گھاٹیاں تھیں جن کو پار کرنے کا یقین نہ تھا۔ اب خیال آیا۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

محمد بخش پانی والے کی نوکری کا سہارا تھا۔ یہاں سے اب بیس روپے ملتے تھے۔ پروفیسر ضامن علی صاحب یونیورسٹی میں اُردو پڑھاتے تھے۔ انھوں نے امید دلائی کہ یونیورسٹی میں سائزرشپ مِل جائے گی۔ یعنی فیس معاف ہوجائیگی یونیورسٹی کے اخراجات کے لیے یہ کافی نہ تھا۔ پھر بھی ہمّت کی اور داخلہ کرالیا الہ آباد یونیورسٹی بہت پُرانی ہے۔ پہلے اس کا دائرہ بہت وسیع تھا اور دور دُور کے کالج اس سے متعلق تھے۔ لیکن اب سمٹ کر ایک کالج رہ گئی۔ پہلے اس کا کام امتحان لینا تھا۔ اب پڑھانا بھی ہوگیا۔ پُرانا میو کالج سائنس فیکلٹی میں تبدیل ہوگیا۔ اور یونیورسٹی ہال کے ارد گرد وسیع دائرے میں آرٹس فیکلٹی بنی۔ چار ہوسٹل تھے ان میں مسلم بورڈنگ ہاؤس بھی شامل تھا۔ پروفیسروں کی رہائش گاہیں شامل کرکے کئی میل کا رقبہ یونیوسٹی میں شامل ہوگیا۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس کی مسلمان طلبہ کے لیے بڑی اہمیت تھی۔ خواہ وہاں رہتے ہوں یا نہ

رہتے ہوں۔ سب ہی اس سے وابستہ تھے اور یہاں کی زندگی میں شریک رہتے۔
یہاں سالانہ مشاعرہ ہوتا کھیل کود کے مشاغل رہتے مسلمان اکابر آ کر تقریریں کرتے اور لڑکوں سے ملتے۔ بارش زیادہ ہوتی تو صحن میں پانی بھر جاتا۔ اس دن بڑی ادھم رہتی۔ سب کو اس میں نہانا پڑتا۔ جو شریک نہ ہوتا اس کو زبردستی دھکیل دیا جاتا۔ غرضیکہ ہر روز ہنگامہ رہتا۔ ہر روز، روزِ عید اور ہر شب، شبِ برات۔
یونیورسٹی کا معیارِ تعلیم بہت بلند تھا۔ یہ ہندوستان کی ممتاز ترین یونیورسٹی سمجھی جاتی تھی۔ یہاں مشہور پروفیسروں کا اجتماع تھا۔ ان میں ڈاکٹر دھار، ڈاکٹر سہا، ڈاکٹر تاراچند، امرناتھ جھا، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، ایشوری پرشاد، تیواری، اور نعیم الرحمان جیسے لوگ شامل تھے۔ جن کی قابلیت دُور دُور تک مشہور تھی۔ ان میں سے بعض کی تصنیفات آج تک کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

ما زہر روشن دلی یک رشتہ فن آموختیم
عقل از مجنوں و عشق از کوہکن آموختیم

ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا وائس چانسلر تھے۔ ان کا کردار اتنا ہی بلند تھا۔ جتنی کہ ان کی قابلیت مشہور تھی۔ یہ ان ہی کا اثر تھا کہ بلند خیالی اور سادہ زندگی یونیورسٹی کا بنیادی اصول بن گیا اور ایسا ماحول پیدا ہوا کہ ہر شخص تحصیل علم میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف رہتا۔ شرارتیں بھی ہوتیں، لڑائیاں بھی ہوتیں۔ سیاسی بے چینی کا زمانہ تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ یونیورسٹی کے طالب علموں پر اس کا اثر نہ ہو۔ لیکن اگر کبھی معلوم ہوتا کہ وائس چانسلر کو کوئی بات ناگوار گزری تو سناٹا چھا جاتا۔ انھیں خود کسی بات میں مداخلت کی ضرورت نہ پڑتی

اساتذہ بھی ایسے تھے جنھوں نے اپنی زندگیاں حصولِ علم اور درس دینے کے لیے وقف کردی تھیں۔ انھیں نہ تنخواہوں کی لالچ تھی نہ زر کی طمع۔ ان پر کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ کسی لالچ سے یا کسی کی سفارش کے دباؤ سے یا مذہبی تعصب کی بنا پر کسی سے رعایت یا کسی پر زیادتی کر سکتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کی وہ عزت تھی جو نہ کسی رئیس کو نصیب تھی نہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدیدار کو۔

میری طالب علمی کا دور غلامی کے زمانے میں بسر ہوا۔ اب اللہ تعالےٰ نے آزادی دی ہے محنت، حصولِ علم اور تنظیم کا خیال پہلے سے زیادہ ہونا چاہیے۔ لیکن دیکھتا ہوں کہ نہ پڑھنے کا شوق باقی ہے نہ استادوں کی عزت۔ ہر ایک کو فکر ہے کہ سفارش یا رشوت سے ڈگری مل جائے۔ کبھی طالب علم سٹرائک کر رہے ہیں کبھی پروفیسر۔ ہر ایک سیاست اور شورش پر اپنی صلاحیتیں صرف کرتا ہے۔ اور ذہنی ترقی اور علمی دوڑ سے دل چسپی نہیں۔ ان میں علم کی طلب کم اور زر و جاہ کی محبت زیادہ ہے۔

کبھی طالب علموں پر گولیاں چلنے کی خبر ہے کبھی یہ خبر ہے کہ انھوں نے دکانیں لوٹ لیں۔ کاروں کو آگ لگا دی اور کتابیں جلا دیں۔ کتابیں کسی زبان کی ہوں، کسی ملک کی ہوں، کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہم ان کو ہمیشہ بیش بہا اور بیش قیمت سمجھے۔ جہاں تنقیدی نقطۂ نظر کے بجائے جذبات کا غلبہ ہو علم کی ترقی اور ذہنی نشوونما ناممکن ہے۔

محض اپنے ملک کے طالب علموں کو ہی قصوروار کیوں ٹھہراؤں۔ دنیا بھر کے نوجوانوں کا یہی عالم ہے۔ مغربی دنیا میں کچھ تو ایسے ہیں جو ترک دنیا، ترک

عقبے، ترکِ مولیٰ، ترک ترک کے اصول کو اپنائے ہوتے ہیں۔ یہ نہ تو منھ دھوئیں نہ صاف کپڑے پہنیں۔ نہ انھیں علم کا شوق نہ ان میں محنت کی اہلیت۔ منشیات میں مست، کسی جرم سے عار نہیں۔ دنیا و مافیہا دونوں کو بھولے ہوئے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو نظام تعلیم، نظام معاشرہ اور نظامِ حکومت سے بیزار ہیں۔ ہر روز بلوے کرتے اور گولیاں کھاتے ہیں۔ نئی نسل نئی طرزِ زندگی کی تلاش میں ہے۔ ان کی خود سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا چاہتے ہیں ہم بڈھے بھلا کیا سمجھیں گے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

میرے کالج میں داخلے کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیوں کی ساتھ تعلیم شروع ہوئی۔ اس وقت صرف دو ہی لڑکیاں تھیں۔ دونوں کشمیری ہندو۔ دونوں کشمیری حسن کی مالک۔ لڑکوں سے ملنا جلنا کم یا نہ ہونے کے برابر۔ جدھر جاتیں اسی طرف سب کی نظریں مڑتیں۔

بہ رُخ سیاہ چشماں نظر از بود گنا ہے
بگذار تا گنا ہے بکنیم گاہ گا ہے

ان میں ایک شام کماری نہرو پنڈت جواہر لال نہرو کی قریبی عزیز تھیں انھوں نے وکالت پاس کی۔ پھر ایک مسلمان سے شادی کی۔ چند سال ہوتے ان سے الہ آباد میں ملاقات ہوئی۔ تفصیلی گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ ہم ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ ان کے شوہر جمیل صاحب اُتر پردیش میں

انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ اب تو شاید پنشن پا چکے ہوں۔

یونیورسٹی میں فوجی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ ہر اتوار کو پریڈ ہوتی۔ بندوق چلانا سکھایا جاتا اور فوجی مشقیں ہوتیں۔ سال میں دو ہفتے کیمپ میں گزرتے جہاں صحیح معنوں میں فوجی زندگی بسر کرنی ہوتی۔ جاڑوں میں خیموں میں رہنا، اور دو کمبلوں میں رات گزارنی ہوتی۔ پانچ بجے صبح سے اُٹھ کر دس بجے رات تک مشغولیت ہوتی۔ پھر وہ سناٹا کہ سانس لینے کی آواز نہ آتی۔ کیمپ میں علی گڑھ، بنارس اور لکھنؤ یونیورسٹی کی کمپنیاں بھی آتی تھیں۔ ان یونیورسٹیوں میں فوجی مشق اور مختلف کھیلوں میں سخت مقابلہ ہوتا۔ اس کو اتفاق سمجھیے یا الہ آباد یونیورسٹی کے ماحول کا اثر۔ ہمیں تمام یونیورسٹیوں پر ہر سال سبقت رہی۔ مختلف یونیورسٹیوں کے طالب علموں کے ایک جگہ اجتماع سے نہ صرف آپس کے مراسم بڑھتے بلکہ بحث و مباحثہ تعلیمی اور ذہنی ترقی کے مواقع بھی نکلتے۔ ہر طالب علم کے لیے فوجی تعلیم ضروری نہ تھی جو چاہتا اپنی مرضی سے شریک ہوتا۔ عادتیں درست کرنے کے لیے فوجی تعلیم سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ میں نے پہلے ہی سال سے اس میں شرکت کی اور ہر سال ترقی کر کے کمپنی سرجنٹ میجر کے عہدے تک پہنچا۔ یہ بڑی عزت تھی۔ اس تعلیم سے فرائض کی انجام دہی کی جو عادت ہوتی اس نے زندگی بدل دی۔ پاکستان میں تو یہ تعلیم لازمی ہونی چاہیے تھی۔ لیکن کسی وجہ سے اس کو ختم کر دیا گیا۔ اب میٹرکولیشن پاس کرنے والوں کے لیے دو برس فوجی تعلیم لازمی کر دی گئی ہے۔ گو اس پر عمل ہونا ابھی باقی ہے۔ میری رائے میں بہتر طریقہ یہ ہوتا کہ اسے اسکول اور کالج کی تعلیم کا لازمی حصہ قرار دیا جاتا۔ اس طرح

فوجی تعلیم بھی زیادہ عرصے تک ہوتی ۔ اور طالب علم کی عمر کے دو قیمتی سال بھی ضائع نہ ہوتے۔ لیکن ؎

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

از جرم گل سیاہ تا اوج زحل
کردم ہمہ مشکلات کلی را حل
بکشادم بند ہائے مشکل بحیل
ہر بند کشادہ شد بجز بند اجل

انٹرمیجیٹ تک سائنس پڑھتا رہا۔ اس امید میں کہ شاید ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر سکوں۔ مالی حالات نے اس کی اجازت نہ دی۔ سائنس پڑھنے کا شوق اس وہم میں بھی ہوا تھا کہ اس طرح کائنات کے راز افشاء ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ ناپ تول اور عناصر کی خاصیت کا مُطالعہ عملی زندگی میں تو مفید ہے لیکن اس سے نہ رازِ حیات معلوم ہو سکتا ہے نہ ذہنی یا قلبی تسلّی ممکن ہے۔ سائنس نے انسان کو چاند تک پہنچا دیا اور وہ دن بھی آئے گا جب اس کی مدد سے ان دنیاؤں تک پہنچنا ممکن ہو گا جہاں آج ہمارا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن یہ نہ خدا تک پہنچا سکتی ہے نہ یہ بتا سکتی ہے کہ انسان کہاں سے آیا، کیوں پیدا ہوا اور اس کا انجام کیا ہو گا انیسویں صدی میں اسپنسر کے فلسفہ کے زیر اثر ہر سوال کا جواب سائنس کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش ہوتی تھی اور قانون فطرت پر اعتقاد کلی پیدا ہو چلا تھا۔ ٹنی سن نے اپنے دوست کی موت پر مرثیہ میں لکھا ہے "میں نہ فطرت کو بُرا کہتا ہوں نہ موت کو۔ کیونکہ ہر چیز قانون کے تابع ہے" تو کیا وجہ تھی کہ ٹینیسن زندہ رہ گیا اور اس کا دوست دنیا سے

چل بسا اور وہ قانون فطرت کیوں نہیں دریافت ہوا جس سے معلوم ہو سکے کہ کون شخص بیس برس کی عمر میں مر جائے گا اور کون ایک سو بیس سال تک زندہ رہے گا۔ میرے دل میں اس قسم کے سوالات اوائل عمری سے ہی پیدا ہو گئے تھے۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ سائنس کے مطالعے سے ان سوالوں کا جواب نہیں مل سکتا تو فلسفے کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ یونیورسٹی میں اسی مضمون کا انتخاب کیا۔

ایں بحر وجود آمدہ بیرون زنہفت
کس نیست کہ ایں گوہر تحقیق بسفت
ہر کس سخنے از سر سودا گفتند
زاں روئے کہ ہست کس نمی داند گفت

تہذیب وتمدن کے آغاز کے ساتھ ہی کائنات کی حقیقت تخلیق کے راز اور انسان کی فطرت پر غور شروع ہوگیا۔ مصر میں ان موضوعات پر تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کی تصنیفات ملی ہیں۔ چین میں ساڑھے بارہ سو سال قبل مسیح کی تصانیف موجود ہیں۔ ہندو گرو آٹھ سو سال قبل مسیح ان مسائل پر تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے دلائل میں وہ وہ باریکیاں پیدا کیں کہ مفکرین آج تک ششدر ہیں ان کے نتائج کسی نے شاعرانہ انداز میں خوب بیان کیے ہیں۔

یہ گورے گورے گال یہ گھونگر والے بال
یہ تیکھی تیکھی چتون یہ ابھرا ابھرا جوبن

مایا ہے سب مایا

سب جھوٹا ہے سنسار ایک سچا سرجن ہار

ہندو فلسفی اس پر بھی زور دیتے رہے کہ مایا کا راز اور برہمن کی حقیقت دلائل سے سمجھ میں نہیں آتے۔ اس کے احساس کے لیے مرشد کامل کی ضرورت ہے مولانا رومی بھی فرماتے ہیں۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا
او نشیند در حضور اولیاء

یُونان میں فلسفی مسائل پر بحث تقریباً چھ سو سال قبل مسیح شرُوع ہُوئی منطق، سیاسیات، جمالیات، اخلاقیات اور مابعد الطبیعات کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر یونانی فلسفیوں نے بحث نہ کی ہو۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا کہ حرکت، تبدل اور نشوو نما ناقابل اعتبار احساسات کا توہم ہیں اور ظاہری صورتوں میں ایک غیر متبدل اصلیت پنہاں ہے جو خُدا ہے۔ کسی نے حواس خمسہ پر نکتہ چینی کی۔ کسی نے ہر چیز کی اصلیت ذروں پر رکھی۔ کسی نے مثالی عالم کا تصور پیش کیا۔

"کس نہ دانست کہ منزل گہہ مقصود کجاست"

مسلمانوں کے توسط سے یونانی فلسفہ یورپ پہنچا۔ یورپین فلسفی ایک مدّت تک تو اسی دائرے میں چکّر لگاتے رہے جس کو سوفسطائیوں نے شروع کیا۔ اور افلاطون اور ارسطو نے چمکایا۔ پھر ڈے کارٹ نے اپنے وجود کے سوا ہر چیز پر شک کر کے دورِ جدید کا آغاز کیا۔ لیکن اس طرح بھی یورپین فلسفی مادیت اور تمثالیت کے اس دائرے سے نہ نکل سکے جس میں یونانی پھنسے رہے آخر کانٹ نے عقل کی حدود کا تعیّن کیا اور یہ ثابت کر دکھایا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اب وجودیت کا دَور دورہ ہے۔ "خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے"

پابندگی رسم ورہ عام سے آزاد ہو اور اپنی مرضی کے مطابق خوش رہو۔ یہ ہپیز کے طرزِ زندگی کا جواز ہے جو یک گونہ بے خودی میں دن رات بسر کرتے ہیں۔

بہت کچھ پڑھا۔ مدّتوں غور کیا۔

یک چند بہ کودکی بہ استاد شدیم
یک چند بہ استادیِ خود شاد شدیم
انجام سخن شنو کہ ما را چہ رسید!
از خاک در آمدیم و برباد شدیم

شبے در جوانی و طیب نعم
جوانان نشستیم چندے بہم
چو بلبل سرایان چو گل تازہ روئے
ز شوخی درافگندہ غلغل بکوئے

اللہ مولانا نامی کو اپنی بخششوں اور رحمتوں سے نوازے۔ الہ آباد یونیورسٹی کا کون مسلمان طالب علم ہوگا جس کے دل میں آج بھی ان کی یاد تازہ نہ ہو۔ مولانا مدتوں مسلم بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ رہے۔ ناٹا قد، گھنی داڑھی، ٹیڑھی ٹانگیں، گندمی رنگ چہرے سے مشفقی اور مہربانی ٹپکتی تھی۔ طالب علموں کی ہر مشکل میں مدد کرنے کو تیار رہتے۔ کتنے ہیں جن کی فیس انھوں نے ادا کی۔ ہر ایک کے آڑے وقت میں کام آئے۔ مذاق اور شرارت کو نہ صرف معاف کرنے کو تیار رہتے بلکہ اس سے لطف اندوز ہوتے۔ ان کی صورت اور باتوں کا کچھ ایسا انداز تھا کہ جو دیکھتا اس کے دل میں گدگدی ہوتی۔ ہر سال لڑکے ان سے بڑے پیمانے پر کوئی مذاق کرتے۔ اور مولانا ناراض ہونے کی بجائے مزے لے کر اپنے دائرہ احباب میں بیان کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک جہاں دو اولڈ بوائز مل بیٹھتے ہیں مولانا کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔

ایک شام باقر الیاس، نظیر عالم، میں اور کچھ دوسرے لڑکے بورڈنگ ہاؤس میں جمع تھے کہ ایک نئی شرارت سوجھی۔ سب مجھے ساڑھی پہنائی گئی۔ مولانا کو کسی نے

جا کر اطلاع دی کہ بافر کے کمرے میں ایک طوائف بلائی گئی ہے۔ مولانا نے آ کر جھانکا تو نظیر عالم میری جانگوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ کمرے میں روشنی بہت کم تھی مولانا کو یقین آگیا کہ واقعی کوئی عورت بیٹھی ہے۔ بھاگ گئے کہ عجب کیا ان لوگوں نے شراب پی رکھی ہو اور مار پیٹ پر اُتر آئیں۔ جو لوگ اس کام پر مامور تھے انھوں نے سمجھایا کہ مولانا ایسی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔ اور اگر ہو بھی تو ہم لوگ موجود ہیں۔ مولانا نے فرمایا اچھا کچھ اور لڑکوں کو بھی بلالو۔ جب بیشتر ہوسٹل جمع ہو گیا تو مولانا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہت تاخیر اور تامل کے بعد دروازہ کھولا گیا۔ اتنی دیر میں مَیں نے ساری اتار دی تھی اور لحاف کے اندر چھپ کر لیٹ گیا تھا۔ مولانا اپنے محافظین کے گھیرے میں کمرے میں داخل ہوتے اور دریافت فرمایا کہ یہاں کون لیٹا ہے۔ جواب ملا کہ مشتاق کے سر میں درد تھا۔ ذرا لیٹے تھے دیر ہو گئی یہیں سو گئے ہیں۔ جگانا مناسب نہ ہوگا۔ مولانا کو اس پر کس طرح اعتبار آتا۔ فرمایا۔ بائی جی مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ اب لحاف سے نکل آیئے۔ میں اپنی جگہ سے نہ ہلا تو مولانا نے لحاف کھینچنا شروع کیا میں نے سخت لہجہ میں ڈانٹا کہا کون ہے پھر اٹھ بیٹھا۔ سارا ہوسٹل جمع تھا۔ قہقہے اور تالیوں سے سارا ہوسٹل گونج اٹھا۔ مولانا بھاگے۔ پھر واپس آئے فرمایا۔

"بازی بازی بارِیش بابا ہم بازی"۔ یہ کہا اور پھر تیزی سے لمبے لمبے قدم رکھتے ہُوئے غائب ہو گئے۔ مہینوں اس کا چرچا رہا۔ بات یونیورسٹی میں مشہور ہو گئی دوسرے پروفیسر بھی مولانا کا مذاق اڑاتے رہے اور یہ شرارت بھی مسلم بورڈنگ ہاؤس کی روایتوں میں شامل ہو گئی۔

باقر اور الیاس الہ آباد ہائی کورٹ کے مشہور وکیل ہوئے اور ان مسلمانوں کی مدد کرتے رہے جنھیں ہم بے یارو مددگار چھوڑ کر اپنی حکومت قائم کرنے پاکستان چلے آئے تھے۔ خدا کرے الیاس خیریت سے ہوں۔ باقر نسبتاً کم عمر میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ نظیر عالم پاکستان کے انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے پر پہنچے۔ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ دیکھیے میری کس دن باری آتی ہے۔

یاران موافق ہمہ از دست شدند
دریائے اجل یکان یکان پست شدند
خوردیم زیک شراب در مجلس عمر
دوری دو سہ پیشتر زما مست شدند

چنیں نقل دارم زمردان راہ
فقیران منعم گدایان شاہ

ایم اے میں پہنچا تو پروفیسر رانا ڈے تشریف لائے۔ یہ پہلے فرگوسن کالج پونا میں تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی نے بڑی مشکل سے ان کی خدمات حاصل کیں۔ ہندو فلسفہ کے مشہور عالم، متعدد کتابوں کے مصنف۔ ہفتہ میں صرف دو گھنٹے پڑھاتے۔ لیکن جادو بیانی کا یہ عالم کہ جس مضمون پر ایک لیکچر دیا سننے والے عمر بھر نہ بھولے۔ چھوٹا قد، کرتا اور دھوتی پہنے، سر پر مرہٹی پگڑی۔ کوٹ پتلون پروفیسروں کا عام لباس تھا۔ انھیں یہ لباس پہنے کبھی نہ دیکھا۔ صاحب ثروت تھے لیکن درویش صفت اور درویش سیرت۔ الہ آباد آئے تو نہایت عمدہ بنگلہ خریدا جس کے بعض کمروں میں سنگ مرمر کا فرش تھا لیکن سوائے کتابوں کی الماریوں کے گھر میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ ان کے گھر جاؤ تو ایک چٹائی بچھائے زمین پر بیٹھے ہوتے، سامنے لکھنے پڑھنے کی چھوٹی سی ڈسک ہوتی۔ اسی چٹائی پر رات کو بھی سوتے۔ ہر وقت چائے پیا کرتے اور جو طالب علم آتا اسے اپنی چٹائی پر بٹھاتے اور اصرار سے چائے پلاتے۔ ان کے گھر میں دس یا پندرہ طالب علم رہتے تھے جو ہندو فلسفہ کے مطالعہ میں مصروف رہتے۔ ان کا کھانا پینا اور اخراجات خود ان کے ذمے تھا۔ چھوت چھات کا گھر میں نام نہ تھا۔ خالص موحد تھے۔ اکثر گیان میں مشغول ہوتے لیکن پوجا پاٹ کے قائل نہ تھے۔

پہلی مرتبہ کلاس میں آئے تو سب کو حکم دیا کہ "زندگی میں میرا مقصد" کے عنوان

سے مضمون لکھ کر لاؤ، ہفتہ بھر کی مہلت تھی۔ لوگ تیس تیس، چالیس چالیس صفحات لکھ کر لاتے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا لکھوں۔ آخری لمحہ پر سات آٹھ سطریں لکھیں مفہوم یہ تھا کہ "یہ زندگی نہ اس قابل ہے کہ اس کا کوئی نصب العین متعیّن کیا جائے نہ انسان کو اپنے ذاتی مقصد کے حصول کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ جب تک زندہ ہوں اس طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں کہ جب خدا کے سامنے حاضر ہوں تو شرمندگی سے سر نہ جھکانا پڑے"۔ رانا ڈے صاحب نے سب مضمون جمع کیے میں نے کاغذ پر لکھی ہوئی چند سطریں پیش کیں تو فرمایا۔ بس اسی قدر لکھ سکے۔ عرض کی کہ کوئی لمبی چوڑی بات سمجھ میں نہ آئی جس پر زیادہ خامہ فرسائی کرتا چپ ہو کر رکھ لیا۔ ہم سبق میری بے بضاعتی پر ہنسے۔ آئندہ ہفتہ پروفیسر صاحب درجے میں تشریف لائے تو فرمایا کہ میں نے سارے مضامین بہت غور سے پڑھے۔ ان میں صرف ایک قابلِ توجہ نظر آیا۔ پھر میرا صفحہ نکالا اور کلاس کو پڑھ کر سنایا۔ اس دن سے میں ان کی توجہ اور شفقتوں کا مرکز بن گیا۔

ایک دن حاضرِ خدمت ہوا۔ چٹائی پر بیٹھ کر چائے کی پیالی ختم کی۔ پھر ان شکوک اور الجھنوں کا ذکر کیا جن میں کانٹ اور ہیگل کی کتابیں پڑھ کر مبتلا تھا۔ فرمایا تم ذات اور صفاتِ الٰہی کو عقل سے پہچاننا چاہتے ہو۔ یہ عقل کا کام نہیں۔ انسان کو ایک قابلیت عقل سے بالاتر ملی ہے۔ اس کو ایمان سمجھو یا معرفت یا وجدان کہو یا کوئی اور نام دو بہر صورت خدا کو پہچاننے کا تعلق اسی سے ہے۔ یہ ہر شخص میں موجود ہے اور اس کی ترقی کے لیے فلسفہ پڑھنے کی ضرورت نہیں صرف اپنا دل ٹٹولنا کافی ہے عرض کی کہ بہت ایسے ہیں جو وجودِ الٰہی پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کی یہ قابلیت کہاں ہے

فرمایا بہت سے ہیں جو اندھے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں روشنی کا تصوّر تک نہیں آسکتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ روشنی کا کوئی وجُود نہیں اور عام انسان اس سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا یا بینائی فریبِ خیال ہے۔

رہ عقل جز پیچ بر پیچ نیست
بر عارفان جز خدا ہیچ نیست

دیکھیے حضرت اکبر کیا فرماتے ہیں۔

ختم جب کرچکا میں اسپنسر
مجھ پہ پڑنے لگی ہر اک کی نگاہ
پوچھا استاد نے کہ سمجھے بھی
ان حقائق نے دل میں کچھ کی راہ
کہدیا میں نے اس کا کل مطلب
صاف ہے لا الہ الا اللہ
ماسٹر نے کہا تو کوڈن ہے
حق پکارا کہ واہ اکبر واہ

بی اے کے بعد رُخصت کے زمانے میں فلسفہ ارتقاء پر اُردو میں ایک کتاب لکھی اس میں ارتقاء کے موضوع پر ہندو فلسفیوں کے خیال، یُونانی فلسفی پارمینڈیز کا نظریہ مولانا رُومی کا شاعرانہ بیان، ڈارون کی تحقیقات، اسپنسر کی مادیّت اور برگسان کے تخلیقی ارتقاء کے فلسفے کا بیان تھا۔ ایک دن اس کا مسوّدہ لے کر حاضر ہُوا۔ راناڈے صاحب اردو نہ پڑھ سکتے اور سمجھتے بھی کم تھے تاہم شروع سے آخر تک

پڑھوا کر غور سے سُنا۔ پھر اپنے پاس رکھ لیا۔ کچھ دنوں بعد مولوی عبدالحق الہ آباد تشریف لائے۔ رانا ڈے صاحب نے مسودہ ان کو دکھایا۔ انھوں نے بھی پسند کیا۔ پانچ سو روپے کا چیک میرے حوالے کیا۔ کچھ دنوں کے بعد انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن سے اس کو شائع کر کے ایک درجن کتابیں بھیج دیں۔ افسوس کہ میرے پاس اس کا کوئی نُسخہ محفوظ نہ رہ سکا۔ لیکن یہ یاد کیا کم ہے کہ نوعمری میں میں نے فلسفہ پر کتاب لکھّی جسے پروفیسر رانا ڈے اور مولوی عبدالحق کے رُتبہ کے عالموں نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور اشاعت کے قابل سمجھا۔

در دیر می زدم من ز درون ندا بر آمد
کہ بیا بیا عراقی تو ز خاصگان مائی

فرگوسن کالج پُونا ہی سے ایک اور پروفیسر تشریف لائے ان کا نام محمد حفیظ سیّد تھا۔ فرانس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انگلستان کے ڈاکٹر آف لٹریچر تھے۔ اُردو پڑھاتے تھے اُردو اور فارسی میں تو ان کی قابلیت مسلّم تھی ہی سنسکرت میں بھی اچھّی استعداد رکھتے تھے۔ تھیوسوفسٹ تھے اور ہندُو سادھوؤں سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ایک دن حاضرِ خدمت ہُوا۔ دیکھا کہ ایک سادُھو چار ابرُو کا صفایا کیے پالتی مارے آسن جمائے آنکھ بند کیے چٹائی پر بیٹھے ہیں اور ڈاکٹر سید سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ مجُھے دیکھتے ہی واپس جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنی سائیکل اُٹھائی مُشکل سے دس بیس قدم گیا ہوں گا کہ دیکھتا ہُوں کہ ڈاکٹر سیّد میرے پیچھے بھاگے آرہے ہیں۔ فرمایا کہ چلو گرُوجی بُلا رہے ہیں۔ میں واپس ہُوا۔ گرُوجی نے اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ چٹائی پر تو جگہ نہ تھی سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اشارہ کیا کہ جُوتے اُتارو۔ میں یو ٹی سی کی پریڈ سے آرہا تھا۔ فوجی جُوتے پہنے تھے اور پٹی بندھی تھی پٹی کھولی۔ جُوتے اُتارے۔ گرُوجی غور سے پیر دیکھتے رہے۔ پاس کاغذ اور پنسل رکھی تھی۔ اس پر دو صفحے لکھ کر میرے حوالے کیا اور چلے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے کاغذ دیکھا تو سنسکرت میں تحریر تھی۔ یہ کون پڑھتا۔ دو دن بعد پھر حاضر ہُوا دیکھا کہ سیّد صاحب غیر معمُولی عزّت بخش رہے ہیں۔ فرمایا کہ گرُوجی سے بڑے بڑے راجہ

مہاراجہ ملنے کے مُتمنّی رہتے ہیں۔ اور یہ بات نہیں کرتے۔ یہ تمُھاری ہی قسمت ہے کہ اُنھوں نے خُود تمھیں بلایا۔ دکھاؤ کیا لکھ کر دیا۔ میں نے وہ کاغذ پیش کیا۔ سیّد صاحب نے ترجمہ سُنایا۔ لِکھا تھا کہ یہ لڑکا مُلازمت کے لیے امتحان دے رہا ہے۔ اس میں اسے کامیابی نہ ہوگی۔ لیکن یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ دُوسرا امتحان دے گا اور کامیاب ہوگا۔ اس مُلازمت میں بہت ترقی کرے گا۔ اس کو سمندر پار جانے کا شوق ہے۔ اتنے سفر کرے گا کہ تھک جائے گا۔ شادی کے مُتعلق بھی پیش گوئی تھی۔ پہلے یورپی سفر سے واپسی پر ہوگی۔ بعض اور باتیں بھی تھیں جن کے ذکر سے طولِ کلام ہوگا۔ خُدا کی قدرت سب باتیں حرف بحرف درست ثابت ہُوئیں۔ اس وقت انڈین پولیس سروس کے امتحان کی تیاری میں مصرُوف تھا۔ مُسلمانوں میں سب سے زیادہ نمبر آئے لیکن تقرر شاہ نظیر عالم کا ہُوا۔ یہ سر محمد سلیمان کے سالے تھے۔ اِن کے اثر سے گورنر سر مالکم ہیلی سے مِل چُکے تھے۔ مجُھ غریب کی رسائی ایسے حکّام تک کہاں۔ خوُن کے گھونٹ پی کر بیٹھ رہا۔ خیال ہُوا کہ انڈین سول سروس کا امتحان دُوں۔ اس کے لیے فیس کے پانچ سو روپے جمع کرانے پڑتے تھے۔ والدہ نے زیور نکالے اور کہا ان کو بیچ کر فیس ادا کرو۔ غیرت نے اجازت نہ دی کہ ماں کے زیور بِکیں۔ ایم اے کے بعد نوّے رُوپے کی ملازمت کی۔ اس عرصے میں آئی سی ایس کے امتحان کی مقررہ عمر گزر چکی تھی۔ انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے امتحان میں شریک ہُوا اور کامیاب ہوگیا۔ گرُوجی کی بات سچ تھی۔ پولیس میں مجُھ جیسا کمزور طبیعت انسان کبھی زیادہ ترقی نہ کر سکتا۔ اگر بہت ترقی بھی کرتا تو شاہ نظیر عالم کی طرح انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے تک پہنچتا۔ حساب کے محکمے میں آڈیٹر جنرل بننا

قسمت میں لکھا تھا۔ جس وقت گرُوجی نے پیشین گوئی کی تھی حالات اس قدر نامساعد تھے کہ ولایت جانے کا خواب تک نہ دیکھ سکتا تھا۔ ملازمت کے زمانے میں رخصت لی اور لندن سکول آف اکنامکس جا کر تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے واپسی پر شادی ہوئی پھر پاکستان میں ایسی مُلازمت ملی کہ ہر سال دو یا تین مرتبہ غیر ممالک کا سفر کرتا۔ اکثر جی چُراتا۔ لیکن مجبوراً جانا پڑتا۔ اس سب کو اتفاق سمجھیں یا گرُوجی کی کرامت۔ میں پیشین گوئیوں کا قائل نہیں۔ لیکن گرُوجی کا لکھا ہُوا پرچہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ ماوراء النفسیات کے فلسفہ کو اب سائنس کی حدوں میں داخل ہونے کا دعویٰ ہے۔ کہیں رُوحوں سے تعلق قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ کہیں ما فوق العادات مُظاہروں کی تحقیق جاری ہے۔ جب منجمد مادّے سے ایسی بے پناہ طاقت پیدا ہو رہی ہے جو کرۂ ارض کو تباہ کر سکتی ہے تو ذہنی اور رُوحانی طاقتوں کا ایسا مظاہرہ کیا عجب ہے جو تصوّرِ انسانی سے بالاتر ہو۔

گرُوجی کی توجہّ کے بعد ڈاکٹر سید اس قدر مہربان ہُوئے کہ ہر جگہ اپنے ساتھ لے جاتے۔ آنند بھون میں ان کا بہت آنا جانا تھا۔ ان کے ساتھ میں بھی بارہا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس وقت جوان تھے۔

بالاتے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

اُردُو ایسی سلیس اور بامحاورہ بولتے کہ بات کرتے مُنہ سے پھُول جھڑتے زبان میں وہ جادُو اور شخصیت میں وہ مقناطیسی اثر کہ جب سامنا ہوتا مُنہ سے آواز نہ نکلتی۔ باتیں سُنا کرتا اور مُنہ دیکھا کرتا۔ یہیں مسز سروجنی نیڈو سے بھی

ملاقات ہوتی رہی۔ سیاست میں ان کے رتبے سے دُنیا واقف ہے۔ سخن فہمی اور علم دوستی میں بھی بے مثال تھیں۔ حضرت اکبر کی بڑی معتقد تھیں اِن کی وجہ سے مجھ پر بہت مہربان رہیں۔ جب آتیں اگر میں خود نہ پہنچتا تو بلوا بھیجتیں۔ بعد میں بمبئی جانا ہوا تو اپنی بہنوں کے نام خط لکھا۔ اسی وجہ سے وہ بھی کرم فرماتی رہیں ورنہ میں کہاں اور سیاسی طبقہ کہاں۔

بنارس تھیوسوفسٹ کنونشن میں بھی ساتھ لے گئے۔ ایک ہندو رئیس کے ہاں ٹھہرنا ہوا۔ ان کا نام ذہن سے اُتر گیا۔ یہ تھے تو برہمن اور طرزِ رہائش بھی ہندوانہ تھا لیکن چھوت چھات نہ برتتے۔ ان کے چوکے میں بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ کنونشن بہت شاندار تھا۔ ہر چیز میں سادگی سلیقہ اور صفائی۔ ہندو لڑکیاں منتظم اور خاطر مدارات میں مصروف شرکا میں مسز اینی بیسنٹ مشہور مقرر، ہندوستان کے حقِ خود ارادی کی حامی اور مذہبی رواداری کی علمبردار بھی شامل تھیں۔ مسٹر کرشن مورتی بھی تھے جنھیں مسز بیسنٹ نے اس خیال سے تعلیم و تربیت دِلائی تھی کہ یہ آئندہ پیغمبر ہوں گے۔ لیکن انھوں نے پیغمبری کے دعویٰ سے انکار کیا۔ ان کی شخصیت جاذبِ نظر اور ان کی تقریر سحر انگیز تھی۔ پاکستان میں تو ان کا نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ لیکن ہندوستان، انگلستان اور امریکہ میں یہ بہت مشہور ہیں۔ اور مذہب اور رسم و رواج کو ترک کرنے کی تلقین کیا کرتے ہیں۔ یہیں مسٹر انڈیل کو بھی دیکھا۔ یہ خود انگریز تھے لیکن ہندوستانی لباس پہنتے تھے۔ ایک ہندو خاتون سے شادی کی تھی جو نہ صرف حسین و جمیل تھیں بلکہ نہایت عمدہ مقرر بھی تھیں۔ تھیوسوفیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر مذہب سچا ہے۔ صرف خدا کی پرستش کے مختلف طریقے ہیں آخر

میں سب مذاہب ایک ہی ہو جائیں گے۔

راہِ ہفتاد و دو ملت می شود ایں جا یکے
زینہار اے طالب حق از در دل نگذری

مشرق وسطیٰ کے عالمی مذاہب میں یہ عقیدہ مُشترک ہے کہ ایک ایسا پیغمبر آئے گا جو سارے عالم کو ایک مذہب پر متفق کر دے گا۔ یہودی پیغمبر ہمیشہ اس کی بشارت دیتے رہے۔ عیسائی اور مسلمان حضرت عیسیٰ کے آسمان سے اُترنے کے منتظر ہیں۔ مسلمان حضرت مہدی کے انتظار میں ہیں۔ لیکن ہندو مذہب میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ تھیوسوفی ہندوؤں میں زیادہ مقبول رہی اور مسلمانوں نے اس پر توجہ نہ دی۔ جہاں خدا کی پرستش انسان کی جبلی ضروریات میں داخل ہے وہیں مذہبی اختلافات ختم کر کے ایک مرکز پر جمع ہونا بھی ذہنی ضرورت ہے۔ شاید اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان میں تھیوسوفی کا پرچار شروع ہوا تھا۔ یہ تحریک ہندوستان کی سیاسی ضرورت بھی تھی۔ یہاں مختلف مذاہب کے پیرو بستے ہیں اور باہمی رواداری ملک کی بقا کے لیے ضروری ہے۔

یونیورسٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد ڈاکٹر سید نے اپنی عمر لوگ کی مشقوں میں گزاری۔ نماز بھی پابندی سے پڑھتے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا لوٹ جاوے ہے جو ایک بار بند

عام بے روزگاری کا مسئلہ تو ہندوستان کے لیے خاصا پرانا تھا لیکن ۱۹۲۹ء میں جب میں ایم اے پاس کر کے متلاشیٔ روزگار ہوا تو تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے یہ مسئلہ سنگین ہو چکا تھا۔ بڑی وجہ تو یہ تھی کہ نوجوان کثرت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تلاش روزگار میں تھے اور اس طبقہ کے لیے خصوصی ذریعہ معاش سرکاری مُلازمت تھا۔ تجارت ان کے بس کا روگ نہ تھا اور صنعتی ترقی انگریزی عہد میں مفقود تھی۔ اس لیے کارخانوں میں بھی مُلازمت کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا لیکن ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عالمی مُعاشی بُحران شروع ہو چکا تھا۔ اس بُحران کی بھی عجیب حکایت ہے۔ پہلی عالمی جنگ کی سزا میں جرمنی کو فرانس، انگلستان اور امریکہ کو بھاری رقم بطور تاوان جنگ کے ادا کرنی پڑتی۔ جرمن کچھ عرصے تک تو بھُوکے مرتے رہے اور تاوانِ جنگ ادا کرتے رہے۔ آخر بات ان کے بس سے باہر ہو گئی اور انھوں نے ادائیگی سے صاف انکار کر دیا۔ ان حکومتوں نے جن کو یہ رقم سالانہ ملتی تھی مجبوراً اپنا خرچ کم کیا۔ اس کا اثر کارخانوں پر پڑا اور اُنھوں

نے بھی کفایت شروع کی۔ اس سے بے روزگاری کی ابتدا ہوئی۔ بے روزگار طبقے نے خریداری کم کی۔ اس سے کارخانوں کی آمدنی اور سرکاری آمدنی اور کم ہوئی۔ وہ زیادہ کفایت کرنے پر مجبور ہوئے یہ سلسلہ ایک مرتبہ شروع ہوا تو رفتہ رفتہ قابو سے باہر ہو گیا۔ کارخانے بند ہونے شروع ہوئے۔ بنکوں نے دیوالیہ ہونے کا اعلان شروع کیا اور سارا کاروبار بند ہونے لگا۔ اس کا تمام دُنیا پر اثر ہوا۔ ہندوستان کو تاوانِ جنگ کا کوئی حصہ نہ ملتا تھا۔ نہ یہاں اتنے صنعتی کارخانے تھے کہ ان کے بند ہونے کا معیشت پر اثر پڑتا۔ لیکن جب یورپ کے کارخانے بند ہونے شروع ہوئے تو اس خام مال کی جو یہاں سے برآمد ہوتا تھا مانگ کم ہو گئی۔ مجبوراً یہاں کی سرکار نے بھی کفایت کی مُہم شروع کی اور بے روزگاری اور مُفلسی کا دَور دورہ ہُوا جو پانچ چھ سال تک جاری رہا۔ گاندھی جی نے عوام کی پریشانی سے فائدہ اُٹھایا اور سول نافرمانی کی دُوسری تحریک شروع کی۔ جس میں سرکار کو ٹیکس نہ دینے کا پروگرام شامل تھا۔ لیکن اس عرصے میں ہندؤوں اور مسلمانوں کا جھگڑا کافی بڑھ چکا تھا۔ اور تحریکِ خلافت فطری موت کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لیے مُسلمان اس میں شریک نہ تھے۔ ورنہ تحریک بہت زیادہ کامیاب ہوتی۔ اس پُر آشوب زمانہ میں مُلازمت آسانی سے نہ مل سکتی تھی۔ خوش قسمتی سے محکمہ پولیس میں ایک مُترجم کی جگہ خالی ہُوئی۔ ہندؤوں پر زیادہ اعتبار نہ کیا جا سکتا تھا۔ سرکار مسلمان کو ترجیح دینا چاہتی تھی۔ اس جگہ نوّے رُوپے ماہوار پر مُقرر ہو گیا میری نشو و نما بھی خلافت اور کانگرسی تحریک کے دَور میں ہُوئی تھی۔ اس لیے انگریزوں سے دُشمنی اور قومی تحریک سے ہمدردی سے مستثنیٰ نہ تھا۔ لیکن مُلازمت ضروری

تھی مجبوراً قبول کیا۔ اس کام میں کانگریسی لیڈروں کی تقریروں کا ترجمہ کرنا پڑتا ایک دفعہ کانگرس کی مجلسِ عاملہ کا خُفیہ اجلاس ہُوا۔ لاٹ صاحب کو بڑی فکر تھی کہ اس میں کیا تقریریں ہوتی ہیں۔ جواہرلال نے پانچ گھنٹے تقریر کی۔ کانگریس نے کارروائی کو خُفیہ رکھنے کی اس قدر کوشش کی تھی کہ کسی کو پانی پینے کے لیے بھی باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن تقریر کا ایک ایک حرف گھنٹے گھنٹے کے وقفہ کے بعد مجھ تک پہنچتا رہا۔ میں ترجمہ کرتا جاتا ساتھ ہی ٹائپسٹ ٹائپ کرتا جاتا تقریر تین بجے شُروع ہُوئی اور آٹھ بجے رات تک جاری رہی۔ نو بجے ترجمے کا اور ٹائپنگ کا کام مکمّل ہو چکا تھا۔ اور ٹائپ کاپی لاٹ صاحب کی خدمت میں روانہ ہو چکی تھی۔ اس پر مجھے دو سو روپے انعام کے ملے۔ ہر چند یہ کام مجھے پسند نہ تھا لیکن اس مُلازمت میں فرصت بہت تھی اور اس طرح مُقابلے کے امتحان کی تیاری کا موقع مل گیا۔ میں نے اس سے پُورا فائدہ اُٹھایا۔ انڈین سول سروس کے امتحان کی عُمر گزر چکی تھی۔ محکمہ حساب کے امتحان میں شریک ہُوا۔ غالباً دو سو اُمیدوار تھے۔

مجنوں و کوہکن ہمہ ہستند لیک عشق
انداخت قرعہ ای و مرا انتخاب کرد

سعدیا حبِ وطن گرچہ حدیث است صحیح
نہ توان مرد بہ سختی کہ من این جا زادم

امتحان میں کامیاب ہُوا۔ اخبار میں نام بھی چھپ گیا۔ لیکن چار مہینے گزر گئے تقرری کے احکام نہ پہنچے۔ دُوسرے کامیاب اُمیدوار کب کے کام شرُوع کر چکے تھے۔ میں احکام کا منتظر تھا۔ احباب نے مشورہ دیا کہ دِلّی جاؤ اور دیکھو کہ کیا قصّہ ہے۔ میرا انتخاب ریلوے اکاؤنٹس سروس کے لیے ہُوا تھا۔ دلّی گیا۔ ریلوے بورڈ کے دفتر پہنچا۔ پریشان پھر رہا تھا کہ کس سے دریافت کروں۔ ایک کمرہ پر دیکھا یعقُوب شاہ صاحب کا نام لکھّا ہُوا ہے۔ شاہ صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر ریلوے فنانس تھے بعد میں پاکستان کے پہلے آڈیٹر جنرل مُقرر ہُوئے۔ مجُھ سے ہمیشہ بھائی کی طرح محبّت کی۔ لیکن اس وقت میں نہ جانتا تھا کہ یہ کون ہیں۔ ایک مُسلمان کا نام دیکھ کر ہمّت ہُوئی۔ میں نے چپراسی کو کارڈ دیا۔ فوراً طلبی ہُوئی اخلاق اور محبّت سے ملے۔ میں نے اپنی پریشانی بیان کی۔ اپنے ساتھ پی آر راؤ صاحب کے پاس لے گئے جو ڈائریکٹر فنانس تھے۔ وہ بھی بہت شفقت سے ملے۔ فوراً فائل مانگی۔ معلُوم ہُوا کہ فائل غائب ہے۔ دو دن تلاش میں لگے۔ بعد میں معلُوم ہُوا کہ ایک ہندُو اسسٹنٹ نے جو تعصّب کے لیے مشہُور تھے چھُپا لی تھی۔ راؤ صاحب نے بہت معذرت کی۔ احکام ٹائپ کیے ہُوتے تیار رکھے تھے۔ لاہور تقرر ہُوا تھا۔ راؤ صاحب نے پُوچھا کہاں جانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا بمبئی۔ فوراً این ڈبلیو

ریلوے لاہور کاٹ کر جی آئی پی ریلوے بمبئی کر دیا اور وہیں دستخط کر کے احکام میرے حوالے کیے۔ الہ آباد واپس ہُوا۔ تیاریاں مکمّل کر کے آبائی وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا۔ اور بمبئی روانہ ہو گیا۔

الہ آباد کے ایک مشہُور سیاسی لیڈر بھی مُبارکباد دینے تشریف لائے اور فرمایا کہ یاد رکھیے کہ آپ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے مُلازمت میں شریک ہو رہے ہیں۔ کسی ہندُو کو آپ کے ذریعے سے ترقی یا فوائد حاصل نہ ہونے چاہئیں۔ آپ کا فرض صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو جس طرح ہو سکے آگے بڑھایئے میں نے جواب دیا کہ مُسلمانوں کی نُمائندگی سے تو مَیں مُنکر نہیں۔ لیکن اگر اس نمائندگی کے معنی یہ ہیں کہ مَیں حق اور انصاف کے اصُول چھوڑ دُوں تو میرے لیے بہتر یہی ہوگا کہ مُلازمت کا خیال ہی ترک کر دُوں۔ آپ کے احکامات پر عمل پیرا ہو کر یُونہی نکال دیا جاؤں گا۔ اور اگر نہ بھی نکالا جاؤں تو میرا ضمیر مجُھے چین نہ لینے دیگا۔ اگر آپ کہیں کہ کسی مُسلمان کی حق تلفی نہ ہونے پائے تو حُکم سر آنکھوں پر۔ لیکن اس سے آگے بڑھنا میرے لیے مُمکن نہ ہو گا۔ اس پر مولانا نے مجُھے بہت سخت سُست سُنائی اور ناراض ہو کر چلے گئے۔

راندم چو از مہرت سخن، گفتی بسوز و دم مزن
دیگر بگو از جان من، جاناں چہ می خواہی بگو

نمی دانم زمنع گریہ مقصد چیست ناصح را
دل از من دیدہ از من اشک از من آستین از من

الہ آباد سے روانہ ہونے سے قبل ایک صاحب نے بتایا کہ بمبئی میں وکٹوریا ٹرمینس اسٹیشن کے پاس ہی تاج ہوٹل ہے اس میں ٹھہر جانا۔ سن چکا تھا کہ میرا دفتر بھی اسی اسٹیشن پر ہے۔ گاڑی سے اُتر کر سیدھا اس ہوٹل میں پہنچا۔ یہاں جو کمرہ ملا اس کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی اور نیچے سے ٹرام جاتی تھی۔ رات بھر ٹرام کی کرخت آواز نے جگائے رکھا۔ رات کی تکلیف سے صبح گھر یاد آیا اور خیال ہوا کہ اب گھر کا سکون ماں باپ، بھائی بہن اور احباب ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئے۔ بے اختیار رونا آیا، ہچکیاں بندھ گئیں۔ کمرے کی دیواریں پتلی لکڑی کی تھیں۔ سانس لو تو دوسرے کمرے میں آواز جاتی۔ یہ بات سارے ہوٹل میں پھیل گئی کہ ایک لڑکا اکیلا کمرے میں رو رہا ہے۔ ہوٹل کے مالک خود تشریف لائے۔ وجہ پوچھنی شروع کی۔ مَیں کیا بتاتا۔ اُنھوں نے سمجھانا شروع کیا۔ رونا اور زیادہ آیا۔

الہ آباد سے ملازم ساتھ گیا تھا۔ اس کو علیحدہ لے جا کر میرے حالات پوچھنے شروع کیے۔ جو جانتا تھا اس نے بتا دیا۔ یہ کانپور کے رہنے والے تھے اور میرے خاندان سے واقف تھے۔ جب معلوم ہوا کہ میں کون ہوں اور کس سلسلے میں بمبئی آیا ہوں تو دوبارہ تشریف لائے۔ ویسے تو "میرے قابو میں نہ پہروں دلِ ناشاد آیا" لیکن اس عرصے میں آنسو پونچھ چکا تھا۔ اب آ کر اُنھوں نے خاندانی تعلقات کا

ذکر کیا اور اصرار شروع کیا کہ ہوٹل میں تکلیف ہو گی۔ میں ان کے گھر چل کر رہوں دو دن انکار کرتا رہا لیکن محبّت اور شفقت کا بھوکا تھا۔ تیسرے دن راضی ہو گیا ان کے بچے کانپور میں تھے خود ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ گو یہاں بھی غُل شور کی کمی نہ تھی لیکن ہوٹل کی نسبت بہت سکون تھا۔ پندرہ بیس دن کے بعد ان کے ایک دوست نے جو روز وہاں آتے تھے اشارہ کیا کہ ان کی ایک لڑکی ہے اس کا رشتہ تمھارے ساتھ ہو جائے تو اچّھا رہے۔ میں گھبرایا۔

عادت بہ نالہ کردہ دِل دردمند من
ترسم گمان کنند کہ در مانم آرزو است

اس عرصے میں دفتر میں لوگوں سے راہ و رسم ہو گئی تھی۔ ان کی مدد سے سولہ میل دُور باندرہ میں مکان لیا۔ یہ مکان سمندر کے نزدیک تھا۔ لیکن پہلے بس میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن جاؤ۔ وہاں سے ریل پر دفتر پہنچو۔ بمبئی شہر کی بھیڑ بھاڑ اور غُل شور سے بچنے کی یہی ایک صُورت تھی۔ مجبُوراً اختیار کی۔

ہر محنتے کہ می کشم از تنگی قفس
کُفرانِ نعمتے الیست کہ در باغ کردہ ام

جی آئی پی پہلے کمپنی کی ریلوے تھی۔ حال ہی میں سرکاری تحویل میں آتی تھی افسر سب انگریز تھے۔ مَیں اسکول میں داخل ہُوا ہی تھا کہ کانگریس کی تحریک شروع ہو گئی۔ اسی وقت سے کھدّر پہننا شرُوع کر دیا تھا۔ کوٹ پتلون کبھی پہنا ہی نہ تھا۔ دفتر پہنچا تو کھدّر کی شیروانی پہن رکھی تھی۔ ناربری صاحب چیف اکاؤنٹس آفیسر تھے۔ کارڈ بھیجا۔ طلبی ہُوئی۔ غور سے سر سے پاؤں تک دیکھتے رہے۔ نہ ہاتھ ملایا نہ بیٹھنے کو کہا۔ کچھ سوچتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ باہر انتظار کرو۔ ڈپٹی صاحب کو بُلا کر کچھ باتیں کیں۔ وہ آئے اور ساتھ دفتر کے ہال میں لے گئے۔ ایک کلرک کو جگہ سے ہٹا کر مجھے بٹھا دیا اور کہا کہ اس سے پُوچھ لو کہ کیا کام کرنا ہے۔ میں شام تک بل پاس کرنے میں مصرُوف رہا۔ سارا دفتر ایک بڑے ہال میں تھا اس میں ہر وقت آتے جاتے سارے افسر گزرتے تھے۔ کسی نے پلٹ کر بات تک نہ کی۔ میں یہ سمجھ کر آیا تھا کہ افسر بن کر جا رہا ہُوں۔ کمرہ ہوگا، چپراسی ہوگا۔ لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ یہاں یہ کیفیت کہ کوئی پُوچھنے والا نہیں۔ صُبح سے شام تک بل پاس کرنے میں سر اُٹھانے کی مُہلت نہ ملتی۔ ناربری صاحب روز پاس سے گزُرتے۔ سلام کرتا، جواب بھی نہ دیتے۔ گھُورتے چلے جاتے دو ہفتے اِسی طرح گزُرے۔ پھر ڈپٹی صاحب نے اپنے کمرے میں بُلایا۔

بیٹھنے کو کہا۔ فرمایا کہ چیف صاحب تمہارا تذکرہ کر رہے تھے۔ تمہارے قومی لباس کی توہین مقصود نہیں۔ لیکن تم نے ایسی مُلازمت اختیار کی ہے جس میں انگریزی لباس پہننے کا دستور ہے۔ تمھیں بھی وردی سمجھ کر یہی لباس اختیار کرنا چاہیئے۔ باہر جو لباس چاہو پہنو۔ لیکن دفتر میں دُوسرے افسروں کی وضع اختیار کرو۔ خیال آیا۔

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہُوا گر اس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

دفتر سے سیدھا ایک مشہور درزی کی دُکان پر گیا اور کوٹ پتلون اور قمیض کی ناپ دی۔ ہفتہ بھر میں کپڑے تیار ہُوئے تو ٹائی لگا، کالا صاحب بن دفتر پہنچا۔ اس مرتبہ ناربری صاحب پاس سے گزرے تو دیکھ کر مسکرائے۔ رُک کر فرمایا کہ میرے کمرے میں چلو باتیں کرنی ہیں۔ اب بہت مہربانی سے پیش آئے۔ کرسی پر بٹھایا، پُوچھا کیا کام کر رہے ہو؟ میں نے کیفیّت عرض کی۔ کہنے لگے کہ سارا دن دفتر میں کام کرنا ٹھیک نہیں۔ تمھیں کتابیں پڑھ کر امتحان بھی دینا ہے آدھے دن دفتر کا کام دیکھو۔ باقی وقت مُطالعہ میں صرف کرو۔ اب کمرہ مُقرّر ہُوا۔ چپراسی تعینات ہُوا۔ کتابیں مُہیّا کی گئیں۔ دُوسرے افسروں کا رویّہ بھی بدلا اور ان سے مراسم بڑھے۔ ہفتہ بھر کے بعد ناربری صاحب نے گھر پر کھانے کے لیے مدعُو کیا۔ سختی نرمی سے بدل گئی۔ ہمیشہ محبّت سے پیش آتے رہے۔ تاکید کی کہ ہفتہ میں ایک بار ضرُور ملو۔ اور جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو فوراً آکر مجھ سے پُوچھو۔ اس کے بعد کام

میں جی لگنا شروع ہوا۔

زجاناں مہرواز ماجاں فشانی ایست
جواب مہربانی مہربانی ایست

گاہے بکوہ وگاہ بہ صحرا گریستم
ہر جا کہ عشق خواست ہماں جا گریستم

تربیت کے زمانے میں ہندوستان کی کافی سیاحت کا موقع ملا۔ کچھ شوقیہ اس لیے کہ ریلوے پاس ہر وقت جیب میں ہوتا اور جہاں جانا چاہتا بآسانی جا سکتا۔ کچھ تربیت کے سلسلے میں دُور دراز مُقامات پر بھیجا گیا۔ پہلے دو ماہ کے لیے پُونا میں خزانہ کا کام دیکھنے کے لیے تعیناتی ہوئی۔ کیا پُرفضا مقام ہے جب بمبئی میں ایک طرف مُوسلا دھار بارش ہوتی۔ اور دُوسری طرف انسان پسینہ سے نہایا ہوتا۔ اس وقت پُونا میں ٹھنڈی ہوا۔ ہلکے بادل اور ہر طرف سبزہ طبیعت کو ترو تازہ کر دیتے۔ بمبئی سے صرف ڈھائی گھنٹے کا راستہ ہے اور یہ راستہ مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ ریل سے منظر دیدنی ہوتا ہے۔ بمبئی سے ہر صاحبِ استطاعت سنیچر اور اتوار گزارنے کو یہاں پہنچا ہوتا ہے۔ پُونا کے دورانِ قیام میں حیدرآباد گیا اور اس اِسلامی سلطنت کی شان دیکھی۔ اورنگ آباد گیا وہاں سے الورا اور اجنتا کے تاریخی غار دیکھنے گیا۔ یہ غار عجائباتِ زمانہ میں سے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام نے جنسی تخیّلات کو دبا کر رکھّا ہے۔ اس کے برعکس ہندُو مذہب نے ان جذبات کو اُبھارا ہے اور عشق و محبّت کے جسمانی اظہار کو بڑی خوب صُورتی سے مذہب کا جزو اور

مندروں کی آرائش کا ذریعہ بنایا ہے۔ ویسے تو ہر مندر میں اس کی شہادت ملتی ہے۔ لیکن الورا اور اجنٹا میں اس فن کو معراج پر پہنچا دیا گیا ہے آج کل کا فلسفۂ نفسیات یہ ہے کہ جنسی جذبات اور تصورات کو دبانے اور چھپانے سے طرح طرح کی ذہنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کو کھول کر سامنے لانا چاہیئے۔ لیکن اس اصول پر عمل کر کے سماج جس پستی کی طرف جا سکتی ہے۔ اس کا اندازہ زمانۂ ماضی کی مختلف تہذیبوں کے زوال اور یورپ کی موجودہ بدحالی سے ہوتا ہے۔ مدراس بھی گیا۔ جدھر جاؤ ایک نئی دنیا اور نئی تہذیب نظر آتی تھی۔ کچھ دنوں بعد لکھنؤ بھیجا گیا۔ وہاں سے کلکتہ اور کلکتہ سے ٹنگلا جہاں آسام کی سرحد پر ٹنگلا بیلساری رنگپارہ ریلوے لائن بن رہی تھی۔ وہاں خاردار تاروں کے پیچھے ایک چھوٹے سے ڈبے میں مہینہ بھر رہا۔ باہر رائفل لیے سنتری پہرہ دیتا۔ رات کو شیر کی گرج سنائی دیتی اور کبھی کبھی مشعلیں جلائے اور ٹین بجاتے دیہاتی چاول کے کھیتوں سے جنگلی ہاتھیوں کو بھگانے نکلتے۔ یہاں کے لوگ قریب قریب ننگے ہوتے۔ عورتیں صرف کمر سے گھٹنے تک جسم کو ڈھکے رہتیں۔ اوپر کا حصہ پورا کھلا ہوتا۔ یہاں سے شیلانگ بھی گیا۔ جس کی خوب صورتی آج بھی یاد آتی ہے۔ یہاں عبدالمتین چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے گھر کھانے پر بلایا گیا۔ جدھر گیا غربت کے آثار نظر آئے۔ ہر طرف سیاسی بے چینی تھی۔ اسی عرصے میں گاندھی جی نے جیل میں برت رکھا۔ لیکن مجھے نہ ان واقعات سے کوئی خاص دلچسپی باقی رہی تھی اور نہ ان کی تفصیل اب یاد ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے اختلافات

بھی بڑھتے جاتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی جو انتہائی روا داری کا ثبُوت دیتے اور سچّے دِل سے چاہتے کہ دونوں صحیح معنوں میں ایک قوم بن کر رہیں۔ مَیں سارے تماشے دیکھتا اور گھُوم پھر کر بار بار بمبئی واپس آتا۔

عالم کی سیر میر کی صُحبت میں ہو گئی
طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

خوشا بمبئی تجھ پہ پیروں کا سایہ
تجھے جیسا سنتے تھے ویسا ہی پایا

شہر بمبئی کی وسعت، ہمہ ہمی، بھیڑ بھاڑ، شور وغل کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے دیکھا ہو۔ الہ آباد ایسے کئی شہروں کو ملا لو تو بھی اس کا مقابلہ ممکن نہیں۔ ہر طرف پانچ پانچ چھ چھ منزل کے مکان۔ ہر مکان اس طرح بھرا ہوا کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ کشادہ سڑکیں۔ ان پر رات دن وہ اژدہام کہ جو الہ آباد میں صرف میلوں میں نظر آتا۔ ٹرام اور بسیں تو ہر طرف نظر آتی ہی تھیں۔ ان کے علاوہ بجلی کی گاڑیاں ہر پانچ منٹ پر چلتیں۔ دو اہم ریلوے لائنیں جی آئی پی اور بی بی سی آئی دونوں کی لائنوں پر مسلسل گاڑیاں چلتیں ہر میل پر ریلوے سٹیشن جن پر رات دن میلہ۔ جو شخص ایسے شہر سے آیا ہو جہاں آمد و رفت کے ذرائع اِکّے ٹانگے، سائیکل اور اکّا دکّا موٹروں پر محدود ہوں۔ اس کے لیے رسل و رسائل کا یہ گورکھ دھندا، یہ عجلت اور یہ تیزی عقل کو چکرا دینے کو کافی تھی۔ شہر کی وسعت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک صبح اخبار کھولا تو معلوم ہوا کہ رات ہندو، مسلم فسادات میں ایک ہزار آدمی مرے۔ لیکن اطمینان سے حسبِ دستور دفتر پہنچا۔ فورٹ کے علاقے میں گھومتا پھرا۔ پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے۔

گرمی کا یہ عالم کہ ہر وقت جسم پر پسینہ اور دسمبر میں بھی بغیر پنکھے کے گزارہ

مشکل پھر جب برسات آئے تو وہ مُوسلا دھار بارش کہ الامان والحفیظ۔دولت کی فراوانی اور افلاس کی انتہا۔ایک طرف کولابا کی شاندار عمارتیں اور مالابار ہِل کے محل اور پُرفضا باغات، دُوسری طرف ریلوے لائن کے کنارے میلوں تک ٹین کی جھونپڑیاں اور سڑک پر سونے والے ہزاروں لوگ۔ آزادیٔ نسواں کا یہ عالم کہ ہر طرف مردوں سے زیادہ عورتیں نظر آتیں غریب سے غریب تر اور امیر سے امیر تر، خوجہ اپنے لمبے کُرتے پہنے ہُوئے، مرہٹی سفید ساریاں پہنے ہُوئے جن کا نچلا حصّہ ٹانگوں کے بیچ سے نکل کر کمر میں کسا ہُوا، پنڈلیاں ننگی۔پارسی ریشمی ساریاں زیب تن کیے ہُوئے ہر قوم کے مردوں سے دوستی اور مراسم کی متمنّی، ہندو عورتیں بھی اس طرح کنارہ کش نہ ہوتیں جس طرح یُو پی میں دستُور تھا۔انگریز عورتیں کالوں کو مُنہ نہ لگاتیں۔لیکن اینگلو انڈین کی کوئی کمی نہ تھی۔ہر طرف زبانِ حال سے آواز آتی۔

صائب ام شب درچمن چنداں کہ خواہی عیش کُن
رُوئے گل واکردہ اند وچشم بُلبل بستہ اند

شہر اہلِ کمال اور اصحابِ شہُرت و ثروت سے بھرا تھا۔ہر چند میرا احساسِ کمتری اور عزلت پسندی مجھے ایسے لوگوں سے دُور رکھتی۔پھر بھی یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایک نوجوان بمبئی جائے اور عطیہ بیگم کے تھری آرٹس سرکل میں حاضری نہ دے۔ بیگم صاحبہ اور ان کے شوہر مشہُور و معرُوف مصوّر فیضی رحمین مالابار ہِل پر جنجیرہ پیلس میں رہتے تھے۔اس کے سنگِ مرمر سے مرصّع صحن اور پھولوں کی خوشبُو سے مُعطّر باغ میں تھری آرٹس سرکل کے جلسے ہوتے۔جن میں بلّوریں جاموں میں قہوہ

کا شربت ملتا اور جنت نگاہ و فردوسِ گوش کا اہتمام ہوتا۔ یہیں مس آزوری کا رقص دیکھا۔ یہ ان کا عنفوانِ شباب تھا اور معراجِ کمال کا زمانہ۔ دل کہتا۔

گر درمیان مستی آن سیمتن برقصد
ہر دم صد آفرینت اندر دہن برقصد

قیامِ پاکستان کے بعد عطیہ بیگم اور فیضی رحمین کو کراچی کی سڑکوں پر گھومتے دیکھا۔ بمبئی میں ان کی شان و شوکت یاد آئی۔ مایوسی اور بے سروسامانی کی حالت میں زبانِ حال سے کہہ رہے تھے۔ ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

میڈم آزوری پاکستان میں بہت شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ اتفاقاً ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ گردشِ ایام اور رخشِ عمر کی برق رفتاری سے ان کی زندہ دلی اور شوخ طبعی میں فرق نہیں آیا۔ خدا نے کچھ ہستیاں ایسی بھی پیدا کی ہیں جو ذہنی اور جذباتی طور پر سدا بہار ہوتی ہیں

اہلِ سیاست میں مسٹر اور مسز نمبیار۔ اور مسٹر اور مسز چھٹو پادیا سے مراسم پیدا ہوئے۔ دونوں بیگمات مسز سروجنی نائیڈو کی بہنیں تھیں مسٹر نمبیار مشہور کمیونسٹ اور مسٹر چھٹو پادیا کانگرسی لیڈر۔ سرکاری ملازم پر ان کی نظرِ عنایت غیر معمولی بات تھی۔ یہ مسز نائیڈو کی توجہ کا اثر تھا۔ کہنے کو تو یہ لوگ ہندو تھے۔ لیکن رہن سہن سارا مسلمانوں کا سا تھا۔ مسلمانوں کی زبان مسلمانوں کا کھانا پینا، مسلمانوں کی عادات۔ اس قسم کے بہت سے ہندوؤں سے ملاقات تھی مسلمان احباب بہت سے پاکستان آچکے ہیں کس کس کا تذکرہ کروں۔

دل صد پارہ را دادم درین شہر
بہر مہ پارہ اے یک پارہ اے دل

مخواں زِ دیرم بہ کعبہ زاہد کہ بردہ از کف دل من آنجا
بہ نغمہ مطرب، بہ عشوہ ساقی، بہ خندہ ساغر، بہ گریہ مینا

محکمہ کا امتحان پاس کر چکا تو معلوم ہُوا کہ لاہور تبادلہ ہو رہا ہے۔ میرا دل بمبئی میں لگ چکا تھا۔ وہاں سے جانا نہ چاہتا تھا۔ دلّی گیا۔ اس کوشش میں کہ تبادلہ منسوخ ہو جائے۔ کامیابی نہ ہُوئی۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ احباب کو خُدا حافظ کہا اور الہ آباد ہوتا ہُوا لاہور پہنچا۔

جہانگیر کے انتقال کے بعد شاہ جہاں ملکہ نورجہاں کو سیاسی مصلحت کی بنا پر نزدیک رکھنا چاہتا تھا۔ درخواست کی کہ لاہور چھوڑ کر دارالسلطنت میں آجائیں۔ لاہور میں وہ مقناطیسی اثر ہے کہ جو یہاں آگیا پھر اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ ملکہ نے جواب دیا۔

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم
جان دادہ ایم و جنّت دیگر خریدہ ایم

میں جس شہر میں پہنچا یہ وہ لاہور تو نہیں تھا۔ جس پر ملکہ نورجہاں جان دیتی تھیں۔ لیکن آج کے لاہور سے بھی بہت مختلف تھا۔ اب اس کی وسعت بہت بڑھ گئی ہے۔ آبادی بڑھنے سے گہما گہمی بھی زیادہ ہے۔ خاص شہر کی گلیاں اور مکان بیشتر وہی ہیں جو اس وقت تھے۔ مگر مکانوں کی جان مکینوں سے ہوتی ہے اور شہر کی چہل پہل اس کی آبادی سے۔ جہاں آج نئی آبادیاں ہیں وہاں لہلہاتے کھیت

تھے۔ جہاں سبزہ زار تھے وہاں اب سڑکیں یا دوکانیں یا جھونپڑیاں ہیں۔ زیادہ حکام انگریز تھے۔ گو یہ الگ تھلگ اپنی دنیا میں رہتے لیکن ان کی بدولت ہر طرف رونق تھی۔ ان کے علاوہ اینگلو انڈین کثرت سے موجود تھے۔ صفائی کا معیار اب سے بہت بلند تھا۔ شہر دولت مند ہندوؤں اور سکھوں سے بھرا تھا۔ ان کی عورتیں زرق برق لباس میں ملبوس مال اور انارکلی کی زینت تھیں۔ شہر میں سکون کا عالم تھا نہ موٹروں کی بہ کثرت، نہ دھواں اُڑانے والی بسوں سے فضا مکدر۔ گو دولت مندوں کی اب بھی کمی نہیں لیکن ہر طرف غل شور اور انحطاط کا عالم ہے۔ اس کو ترقی کہیں یا تنزّلی، یہ اپنے اپنے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ بہر صورت وہ کشش باقی نہیں ہے جو پہلے تھی۔

علاّمہ اقبال کی زیارت کا مدّت سے شوق تھا۔ جلد ہی حاضرِ خدمت ہُوا جس نے ان کی درویش منشی دیکھی ہے کبھی بھول نہیں سکتا۔ چارپائی پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ سامنے دو تین کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک کرسی پر مجھے بیٹھنے کا حکم ہُوا۔ مذہب اور فلسفہ کے ایسے سبق دے کر اُٹھا جن کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ حضرت اکبر سے رشتے کا حال سُن کر ایسی شفقت برتی جس کا مَیں مستحق نہ تھا۔ ان کے مداح اور معتقد تھے۔ دیر تک ذکر کرتے رہے۔

کچھ دنوں بعد اسلامیہ کالج میں مشاعرہ ہُوا۔ پرنسپل صاحب مہربان تھے کھانے اور مشاعرے میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ ہم کالج میں مشاعرہ کرتے تو قالین بچھتے گاؤ تکیے لگتے۔ مسند لگتی اور جہاں تک ہو سکتا مشرقی تہذیب کی فضا پیدا کی جاتی یہاں دیکھا کہ ہال میں کرسیاں لگی ہیں۔ ڈائس پر اونچی میز ہے اس پر کھڑے

ہو کر کلام سُنایا جاتا ہے۔ ایک صاحب لکھنؤ سے بھی تشریف لائے تھے۔ ہمہ تن لکھنوی، دُبلے پتلے، دوپلّی ٹوپی، تن زیب کا انگرکھا زیب تن۔ ایک قدم چلتے تو دس بار کمر لچک کھاتی۔ فرمایا، رُباعی عرض ہے۔

مسجد میں مُسلمان بناتے جاتے ہیں
مندر میں شرمیان بناتے جاتے ہیں

اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ غُل ہُوا کہ چھت اُڑنے لگی۔ انھوں نے لجاجت سے کہا "حضرات میں آپ کے ذوق اور ادب پرستی کی تعریف سُن کر بہت دُور سے آیا ہُوں میرے شعر سُن لیجئے اگر پسند نہ ہوں تو داد نہ دیجئے لیکن مجُھے کچھ عرض کرنے کا موقع دیدیجئے"۔ اس پر مزید شور و غُل ہُوا۔ جناب صدر کھڑے ہُوئے اور یُوپی والوں کو سخت سست کہنا شرُوع کیا۔ یہ بھی کہا کہ یہ زبان کو اپنی جائداد سمجھتے ہیں اور بات کرنی نہیں آتی۔ اب تک تو میں شور و غل کو تفریحی نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا۔ شاعر کی صُورت مذاق کی دعوت دیتی تھی۔ لیکن جناب صدر کی اس خطۂ ارض کے جس سے میرا تعلق ابھی تازہ تھا، تمام لوگوں پر نکتہ چینی ناگوار ہُوئی۔ خاموشی سے اُٹھ کر باہر آگیا۔ میرے پیچھے پرنسپل صاحب اور کچُھ اور احباب دوڑے۔ سمجھا بُجھا کر واپس لائے۔ لکھنوی حضرت تو اپنا کلام نہ سُنا سکے۔ لیکن مُشاعرہ جاری رہا اور بہت پُر لطف رہا۔ بعد میں معلُوم ہُوا کہ یہ اس بے ادبی کا ردِ عمل تھا جو جناب ابُوالاثر حفیظ جالندھری کے ساتھ الٰہ آباد میں مُسلم بورڈنگ ہاؤس کے مُشاعرے میں کی گئی تھی۔ حفیظ صاحب کھڑے ہو کر کلام ترنم سے سناتے ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس کے لڑکے ایک ڈھولک لے آتے تھے۔ حفیظ صاحب کی

طبعِ نازک اس بدتمیزی کو کب برداشت کرتی۔ بات لاہور میں بھی مشہور ہو گئی اور لاہور کے اہلِ ذوق نے ایک غیر معروف لکھنوی سے اس کا بدلہ لیا۔ اس واقعہ کو سُن کر احساس ہُوا کہ یہ صوبائی تعصب کا مُظاہرہ نہ تھا۔ سچ پوچھئے تو اس وقت مسلمان ایک تھے اور تعصب کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لاہور کے نئے مسکن میں ہر مُسلمان نے مجھے دل میں جگہ دی۔ آنکھوں پر بٹھایا۔ اور کبھی یہ محسُوس نہ ہونے دیا کہ غیر شہر میں آیا ہُوں۔

کچھ ہی دنوں بعد عید آئی۔ یہ پہلی عید تھی کہ گھر نہ جا سکتا تھا

عید گاہ ما غریباں کُوئے تو

انبساطِ عید دیدن رُوئے تو

اُداس بیٹھا تھا۔ کپڑے بھی نہ بدلے تھے۔ ایک دوست آواز دیتے ہُوئے پہنچے کہ ابھی تک تیار نہیں ہُوئے۔ چلو نماز پڑھنے۔ میں نے جلدی سے کپڑے بدلے وضو کیا اور ان کی موٹر پر بادشاہی مسجد روانہ ہُوا۔ مسجد کے پاس پہنچ کر انھوں نے کہا کہ تم مُسجد میں جاؤ۔ میری جماعت کی نماز علیحدہ ہوتی ہے۔ مَیں اس میں جا رہا ہُوں مُعمّہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ مسلمانوں میں علیحدہ جماعتوں کے کیا معنی۔ میں نے کہا کہ جہاں تُم نماز پڑھو گے وہیں مَیں بھی پڑھوں گا۔ انھوں نے سمجھایا کہ ہم قادیانی ہیں ہماری جماعت علیحدہ ہوتی ہے۔ قادیانیت پنجاب کا مسئلہ تھا۔ یُوپی میں اس کا ذکر ہی نہ تھا۔ میں نے اس کا نام تک نہ سُنا تھا۔ میں نے کہا کچھ بھی ہو مسلمانوں کی نماز ہے جہاں تُم وہاں میں۔ چنانچہ قادیانیوں کی جماعت میں نماز پڑھی۔ میرے دوست ہی نے امامت فرمائی۔ بڑی مسجد میں جاتا تو نماز کے بعد جُوتے بغل میں دبا کر دھکے کھاتا

چلا آتا۔ کوئی اٹ کر بات بھی نہ پوچھتا۔ یہاں میں سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ باری باری ہر ایک گلے ملا اور ہر شخص سے تعارف ہُوا۔ اکثر ممتاز اصحاب موجُود تھے۔ مجھے اس توجہ پر تعجب ہُوا۔ تین چار دن کے بعد میرے دوست نے کہا کہ مرزا بشیر احمد صاحب نے قادیان آنے کی دعوت دی ہے۔ اِس عرصے میں اس جماعت کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر چکا تھا۔ شوق ہُوا کہ خلیفۂ وقت کی بھی زیارت ہو جائے۔ قادیان گیا اور تین دن مہمان خانے میں رہا۔ وہاں کے مبلغین سے کافی گفتگو رہی مرزا صاحب سے بھی کئی ملاقاتیں ہُوئیں۔ میرے دوست بھی مہینوں سمجھانے میں مصرُوف رہے۔ لیکن مجھ پر اثر نہ ہُوا

مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

کچھ دنوں بعد میرے دوست بھی جماعت سے علیحدہ ہو گئے یا علیحدہ کر دیئے گئے۔ یہ دُوسری داستان ہے جو شنیدنی ضرور ہے لیکن لکھ نہیں سکتا۔

زدست طالع بدمی رویم شہر بشہر
چو بدقمار کہ تغییر می دہد جا را

مثل مشہور ہے دھوبی کا کُتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ یہی کیفیت اعلیٰ سرکاری ملازمین کی ہوتی ہے ایک جگہ بیٹھنے نہیں پاتے کہ دُوسری جگہ تبادلہ ہو جاتا ہے کہیں مکان میسر ہوتا ہے کہیں خیمے یا ریسٹ ہاؤس میں گزارا کرتے ہیں۔ نہ جسمانی آرام کا پُورا موقع ہوتا ہے۔ نہ ذہنی سکُون میسّر ہوتا ہے۔ بچوں کی تعلیم کی وہ بربادی ہوتی ہے کہ الامان والحفیظ۔ آج ایک اسکول ہے تو کل دُوسرا۔ آج ایک کورس پڑھ رہے ہیں تو کل دُوسری کتابیں یاد کرنی ہوں گی۔ طفلی میں نئے مقامات اور نئے لوگوں سے مانوس ہونے کی کوشش ذہن پر ایسے اثرات پیدا کرتی ہے کہ تاعمُر توازن قائم نہیں ہوتا۔ ماں باپ کی عزت اور خوش حالی کی اصل قیمت بچوں ہی کو ادا کرنی ہوتی ہے لیکن موجودہ سرکاری ملازمت میں نہ تو عزت باقی رہی ہے۔ نہ تنخواہ ہی اتنی ہوتی ہے کہ فارغ البالی سے زندگی بسر ہو۔ نام ہی نام ہے۔ میری ابتدائے ملازمت میں یہ حال نہ تھا۔ تنخواہ بھی کافی ہوتی اور عزت بھی۔ لیکن تبادلوں کے معاملے میں مجھ پر بھی وہی گزرتی تھی جو آج دُوسرے حکام پر گزرتی ہے۔

ابھی لاہور میں قدم جمنے نہ پائے تھے کہ راولپنڈی کا تبادلہ ہو گیا۔ چار مہینے رہ کر لاہور آیا۔ پھر کراچی بھیج دیا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو ملتان جانا پڑا ملتان سے واپس ہُوا تو دلی بھگا دیا گیا۔ عرضیکہ تمام ملازمت لاہور، دلی، فیروزپور، کراچی

راولپنڈی، ملتان بار بار آنے جانے میں گزری۔ کچھ عرصہ نرائن گنج میں بھی رہا۔ لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ جہاں تعیناتی ہوتی اس کے آس پاس کے چھوٹے مقامات کا برابر دورہ کرنا پڑتا۔

سوختم اما نبودم شمع ساں یکجا مقیم
چوں چراغ کارواں ہر شب بصد جا سوختم

انگلستان جا کر تعلیم مکمل کرنے کا جنون سر پر سوار تھا ۱۹۳۶ء تک بہت سی رخصت جمع ہو چکی تھی ایک ایک پیسہ بچا کر کچھ رقم بھی پس انداز کر چکا تھا۔ ملتان میں تھا کہ سال بھر کی رخصت لی اور انگلستان روانہ ہوا۔ اس وقت ہوائی جہاز کا سفر عام نہ تھا کہ چند گھنٹے میں لندن پہنچ سکیں۔ پانی کے جہاز سے سفر ہوتا فرانس تک جہاز میں جاؤ اور پھر ریل سے سفر کرو تو دو ہفتے لگتے اور اگر سارا راستہ جہاز سے طے کیا جائے تو تین ہفتے۔ کفایت کے خیال سے میں نے تمام سفر جہاز سے طے کیا۔ انگریز ہزاروں کی تعداد میں ہر سال جاتے۔ ہندوستانی نسبتاً کم۔ صرف خواص کے لیے ممکن تھا۔ کسی قسم کی پابندی نہ تھی نہ زر مبادلہ کا جھگڑا۔ نہ پاسپورٹ کی دقت۔ نہ ویزا کی ضرورت۔ کرایہ ادا کرو اور ٹکٹ لو۔ جتنے پاؤنڈ چاہیئے ہوں بنک سے مل جاتے۔ نہر سویز سے جہاز گزرنے میں بہت دیر لگتی۔ کُک کمپنی کا انتظام تھا کہ جو مسافر چاہتے ان کو بندرگاہ سویز سے کار پر قاہرہ لے جاتے ابوالہول اور اہرام کی سیر کرا کر پورٹ سعید میں جہاز پر پہنچا دیتے میں نے بھی اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ پورٹ سعید سے موسم بدل جاتا اور یک بارگی خنکی شروع ہو جاتی گرمیوں کے کپڑوں میں قاہرہ کی گرمی سے لوٹا تو سرد ہوا سے زکام اور کھانسی میں مبتلا ہو گیا۔ باقی

راستہ بیماری میں گزرا۔ جوانی کا زمانہ۔ کھانسی زکام کی کسے پروا تھی۔ انگلستان پہنچا تو بہار کا موسم تھا۔ زندگی میں ایسا سبزہ اور یہ تازگی نہ دیکھی تھی جو اب نظر سے گزری غالب کا قطعہ یاد آیا۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطّۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکش سطح چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

غالب نے یہ تصویر معلوم نہیں کیونکر کھینچی۔ ہندوستان میں بہار کب آتی ہے کہ انھوں نے دیکھا ہو۔ سردیوں کے خوشگوار موسم کے بعد گرد اڑنے لگتی ہے اور ہر روز تمازت آفتاب میں تیزی بڑھتی جاتی ہے۔ درخت پر نئے پتے ضرور نکل آتے ہیں۔ لیکن زمین پر سبزہ کہاں۔ بہار کا موسم تو سرد ملکوں ہی میں نظر آتا ہے۔ خصوصاً انگلستان میں جہاں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہوتا ہے۔

سمندر سے تو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اب ہوائی جہاز سے سفر کرو تو جب تک ایشیا پر پرواز رہتی ہے سوائے گرد اور ریت کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ادھر یورپ پہنچے اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔ اس پر سُرخ چھتوں کے مکان نگینوں کی

طرح جڑے ہوتے ہیں۔

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حُور و قصور

اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حُور

لندن میں میرے پُرانے رفیق ڈاکٹر مسعود حسین نقوی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے جس مکان وہ رہتے تھے وہیں میرے لیے کمرہ لے لیا تھا۔ ان کے ساتھ جاکر رہ گیا۔ ان کی موجودگی کی وجہ سے نہ صرف تنہائی کی تکلیف محسوس نہ ہوئی بلکہ اجنبی جگہ پر بے شمار دقتوں سے بچ گیا۔ یہ ہیمپسٹیڈ میں رہتے تھے جو بہت خاموش اور پُرفضا مقام تھا۔ لیکن شہر ریل سے آنا پڑتا تھا۔

اب جاتا ہُوں تو اس وقت کا انگلستان یاد آتا ہے۔ لندن دُنیا کے عظیم ترین شہروں میں تھا۔ پھر بھی اس وقت کی سی بے سکُونی نہ تھی۔ فضا میں تازگی آبادی مختلتی، صاف اور خوش پوش، ایمان داری کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ سڑک پر جاتے ہُوئے ایک شلنگ کا سکّہ جیب سے گر گیا تو ایک لڑکا پیچھے دوڑا کہ یہ آپ کی جیب سے گرا ہے۔ حال میں کسی نے دو سو پونڈ جیب سے نکال لیے خوش قسمتی سے یہ ٹریولر چیک تھے اور رقم امریکن ایکسپریس نے ادا کر دی۔ جہاں سوائے سبزے کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اب سڑکیں ہی سڑکیں ہیں اور پٹرول کے دھوئیں سے سانس لینا مشکل ہے۔ ہر طرف افیم اور چرس کھانے والوں کے اژدہام سے کندھے سے کندھا چھلتا ہے۔ ان کی صورت دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ عمر بھر میں کبھی منہ نہیں دھویا۔

لندن پہنچ کر پہلے ایل ایم ایس ریلوے میں کام سیکھتا رہا۔ پھر لندن اسکول

آف اکانومکس میں داخلہ کرا لیا۔ اس وقت ہارورڈ کا نام بھی نہ سنتے تھے بمعاشیات کے شعبہ میں لندن اسکول آف اکانومکس کا شہرہ تھا۔ یہاں کے پروفیسروں میں ہیرلڈلاسکی، ڈالٹن اور گریگری شامل تھے۔ دُنیا میں ان کے نظریات کا شہرہ تھا۔ ڈالٹن صاحب بعد میں انگلستان کے وزیر خزانہ ہُوئے اور گریگری صاحب ہندوستان میں فنانس ممبر رہ چکے تھے۔ ان کے درس کا فیض معمُولی بات نہ تھی۔

ہندوستان سے چلا تو والدین کو یہ اندیشہ تھا کہ کسی میم سے شادی کرے گا یہاں عجائباتِ دُنیا دیکھنے اور تحصیلِ علم سے کسے فرصت تھی۔

ہمہ شہر پرز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

امریکہ جانے کا بھی شوق تھا۔ تنگ دستی نے اجازت نہ دی ریلوے کی ملازمت کا ایک فائدہ یہ تھا کہ دنیا کی اکثر لائنوں پر مُفت سفر کی اجازت تھی۔ اس رعایت سے پُورا فائدہ اٹھایا۔ یورپ کی کافی سیاحت کی۔ البتہ رُوس جانے کی اجازت نہ ملی۔ لیکن یورپ کے دوسرے ملکوں کی سیر خُوب رہی۔ یہ سفرنامہ نہیں کہ ہر ملک اور ہر شہر کے حالات بیان کروں۔ نہ اتنے دنوں کے بعد دلچسپ کی باتیں یاد ہیں۔ البتہ ہٹلر کا جرمنی یاد آتا ہے۔ یہاں سفر کے لیے خاص طور پر سستے مارک ملتے تھے۔ اس وقت وہاں کھانے کو رائی کی سیاہ روٹی ملتی تھی۔ اور مکھّن مشکل سے نظر آتا۔ پالیسی یہ تھی کہ مکھن کھانے کی بجائے اسی رقم سے ہتھیار بنائے جائیں۔ نازی پارٹی کے ممبر سیاہ وردی پہنے اور تلواریں لگائے ہر طرف گھومتے پھرتے۔ ایک یہودی کے نام تعارفی خط لندن سے لے کر گیا تھا۔ اس کے گھر گیا تو خوف اور

مایوسی کا دل شکن منظر دیکھا۔ دروازہ کھٹ کھٹایا تو اس نے پہلے ایک سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ اسی سوراخ میں سے خط لیا۔ پڑھنے کے بعد اندر بلایا اور اپنے خوف اور خطرے کی کیفیت بیان کی۔ کہا کہ کوئی اعتبار نہیں کہ کس وقت کوئی نازی آکر مار ڈالے۔ اس کی خوف زدہ آنکھیں اور مایوس چہرہ نہیں بھولتا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ مظلوم قوم جلد ہی ظالموں میں تبدیل ہو جائے گی۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔

سجایا ہے یوں خانۂ دل کو میں نے
کہ اس میں کوئی آج مہمان ہوگا
چلو چل کے دیکھیں جگر کا تماشا
سنا ہے وہ کافر مسلمان ہوگا

عرصے سے ماں باپ مُصر تھے کہ جلد شادی کرو۔ میں ٹالتا تھا۔ ولایت سے واپسی پر کوئی حجت باقی نہ رہی تھی۔ عمر بھی کافی ہو چکی تھی۔ لیکن طبیعت آمادہ نہ تھی۔ احباب بھی اصرار کرتے اور مختلف تجویزیں کرتے۔ ایک اصولی دقت بھی تھی۔ میں انگریزی روایتوں سے متاثر تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کسی ایسی لڑکی سے کیوں کر شادی ہو سکتی ہے جس کو میں نے دیکھا ہی نہ ہو۔ اس وقت کے متوسط طبقہ کے مسلمانوں میں اس سے بڑا کوئی عیب ہی نہ تھا کہ نکاح سے پہلے کسی لڑکی پر نگاہ پڑ جائے آخر ایک ہندو دوست کی ایک تجویز پسند آئی جو پرانے اور نئے خیالات کے بین بین تھی۔ لیکن والدین راضی نہ ہوئے۔ بات بگڑ گئی اس کا صدمہ رہا۔

نتوان ہزار سال بطوفان نوح شست
شرحے کہ ما بدل زتمنا نوشتہ ایم

اس عرصے میں والد کو فالج کا دورہ پڑا۔ ان کو دیکھنے الہ آباد گیا۔ مجھے دیکھ کر رونے لگے اور کہا کہ میرے مرنے کا وقت آگیا اور تمہاری شادی کی آرزو دل میں لے جاؤں گا۔ یہ تقریر ایسی نہ تھی کہ دل پر اثر نہ ہوتا۔ والدین کی مدت سے خواہش

تھی کہ سید عشرت حسین صاحب کی صاحبزادی سے رشتہ ہو۔ میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اتفاق سے اسی دن شام کو ان کی دوسری لڑکی کا نکاح انعام اللہ صاحب سے جو بعد میں لاہور کے چیف جسٹس ہوئے قرار پایا تھا۔ والدین کے اصرار پر عشرت صاحب راضی ہوئے کہ میرا نکاح بھی ساتھ ہی ہو جائے۔ اس طرح صبح سات بجے میں نے رضامندی کا اظہار کیا اور شام کو نو بجے نہایت سادگی سے نکاح ہو گیا۔ والد صاحب فراش تھے صرف میرے بھائی بارات میں ساتھ گئے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب نے نکاح پڑھایا۔ مسٹر جسٹس سلیمان گواہوں میں تھے۔ رخصتی دو مہینے بعد ہوئی وہ بھی اسی سادگی سے۔ بیوی کو ساتھ لے کر دہلی چلا گیا جہاں اس وقت تعیناتی تھی۔ خسر نے اکاون ہزار مہر بندھوایا تھا۔ بعد میں میں نے مہر بڑھا کر ایک لاکھ کر دیا۔ گو یہ اقدام بے معنی تھا۔ زندگی میں جو کچھ میسر ہوا ان ہی کا ہونا تھا اور ہوا۔ لیکن مجھے جذبات کا اظہار کرنا تھا۔ بیوی کو دستاویز دی تو انہیں بہت تعجب ہوا۔ ان کو ضد تھی کہ وہ مہر معاف کریں گی۔ تین لڑکے ہوتے ایک لڑکی ماشاءاللہ سب جوان ہو چکے۔ ہم میاں بیوی قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔

زلیست کا ہم پر گماں دیکھیے کب تک رہے
رابطہ جسم و جاں دیکھیے کب تک رہے

فیضی گماں مبر کہ غمِ دل نہ گفتہ ماند
اسرارِ عشق آنچہ تو آں گفت گفتہ ایم

اس سیاسی اور تاریخی پس منظر کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس کی بدولت میری ساری زندگی خوف اور نفرت میں گزری اور جس نے میرے خیالات اور جذبات کی تشکیل کی۔

کہنے کو مسلمان اس برصغیر میں باہر سے فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے لیکن آج جو بیس کروڑ مسلمان یہاں آباد ہیں ان کا بیشتر حصّہ اسی خطّہ کی ہندو آبادی کی اولاد ہے۔ محمد بن قاسم کے ساتھ جو عرب پہلی بار ہندوستان میں داخل ہوئے ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ یہ سندھ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ بعد میں پٹھان اور مُغل آئے۔ مغلوں کی فوج صرف بارہ ہزار تھی۔ پٹھانوں کے مختلف حملوں میں بھی وقتاً فوقتاً اسی تعداد میں مسلمان باہر سے آتے رہے۔ ان کے علاوہ بھی مسلمان تلاشِ معاش میں آئے۔ ان میں سے بیشتر نے اس ملک کی عورتوں سے شادی کی جس سے ان کی نسل چلی۔ لیکن ان سب کی مجموعی تعداد دال میں نمک سے زیادہ نہ تھی۔ باہر سے آنے والوں نے بزورِ شمشیر اپنی حکومت تو قائم کر لی لیکن تلوار اس ملک کے باشندوں کا مذہب نہ تبدیل کر سکتی تھی۔ آج جو ہر طرف مسلمانوں کی آبادی نظر آتی ہے اس کے بانی اہلِ تیغ نہ تھے۔ بلکہ وہ اولیاء کرام تھے۔ جن سے اللہ نے اس سرزمین کو نوازا۔ یہ حضرت داتا گنج بخش، حضرت

نظام الدین اولیاء، خواجہ اجمیری اور دُوسرے اہلِ طریقت اور ان کے خلفا تھے جنھوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کی اور تلوار کی نفرت کے بجائے اپنے فیض اور اپنی محبت سے عوام کا دل موہ لیا۔ ہندو مذہب کی دیواریں اتنی کچی تھیں کہ اسلام کی تبلیغ کی تاب نہ لاسکیں اور ہندو جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے رہے۔ اگر ہم اپنے بزرگوں کے طرزِ عمل پر قائم رہتے اور میل ملاپ اور محبت کو نفرت اور لڑائی جھگڑوں میں تبدیل نہ کردیا جاتا تو آج برصغیر کی بیشتر آبادی اسلام کی پیرو ہوتی۔

مغل ہندوؤں سے میل ملاپ اور قرابت داری کی پالیسی کی بدولت ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تسلیم شدہ بادشاہ تھے۔ اور مسلّمہ سیاسی اثر و رسُوخ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ نادر شاہ کے حملے کی تباہی اور سلطنتِ مُغلیہ کی بربادی کے بعد ملک میں مختلف حکمرانوں نے خُود مختار ریاستیں قائم کرلیں یہ حکمران ہندُو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ لیکن ان میں سے ہر ایک مُغل بادشاہ کے نام پر حکومت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دُشمن مرہٹوں نے بھی ہندوستان پر حکُومت کی بنیاد ان ہی بادشاہوں کے نام پر رکھنی چاہی اور بادشاہ وقت کو قید کرکے اس کی طرف سے احکام دیتے رہے۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی طاقت کا خاتمہ کیا تو انگریزوں نے پیر پھیلانے شرُوع کیے۔ انھوں نے بھی اپنی حکومت مغل بادشاہوں کی وزارت کے نام سے شرُوع کی تھی۔ لیکن انھیں ہر قدم پر مسلمانوں کا سیاسی اثر اور اقتدار واپس لینے کی خواہش کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی ساری طاقت ان ہی کا مُقابلہ کرنے میں لگی۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا تو نہ صرف

باغی فوج کی بلکہ ہر انگریز دشمن کی نگاہیں دلّی کے تخت کی طرف اُٹھیں۔ بادشاہ کی ضعیفی اور نا اہلیت تمام طاقتوں کو ایک جگہ جمع نہ کر سکی اور انگریز پھر فتح یاب رہے۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے اثر کو مٹانے کی ٹھان لی۔ خاندان شاہی تہ تیغ ہوا۔ جو بچے، گلی گلی بھیک مانگنے پھرے۔ ممتاز مسلمانوں کو چُن چُن کر پھانسی دی گئی۔ ان کے محلوں پر گدھے کے ہل چلائے گئے۔ تعلیمی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کو ترجیح دی جانے لگی۔ ہندو ہزار سال سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے لیے مسلمانوں کے بجائے عیسائی حکومت کے قبضہ سے اتنا زیادہ فرق نہ ہُوا تھا کہ وہ اس کی مخالفت میں اپنے کو زیادہ تباہ کرتے۔ اُنھوں نے تیزی سے ملک کی معاشی زندگی اور سرکاری نظام پر قبضہ کرنا شروع کیا اور مسلمانوں کو ہر شعبہ سے دُور رکھنے کی جد و جہد میں انگریزوں کے ساتھ پُورا تعاون کیا۔ انھیں اپنی غلامی کا بدلہ لینا تھا اور ان کروڑوں سے بھی حساب چکانا تھا جو ان کا مذہب چھوڑ کر اسلام پر ایمان لاتے تھے۔ مسلمان شکست خوردہ تھے۔ لیکن ان کی خودداری اجازت نہ دیتی تھی کہ انگریزوں کے سامنے سر جھکائیں۔ شروع میں وہ خود انگریزی تعلیم اور انگریزوں سے تعاون سے دُور رہے۔ ان کی قومی غیرت کہتی تھی۔

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
اُٹھے ہیں جفا پیشگانِ محبّت
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر

حکومت ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لیکن مزاج سے ریاست نہ گئی تھی۔ قرض لے کر اور جائیداد بیچ کر اعلیٰ معیارِ زندگی برقرار رکھتے۔ اس طرح انگریزوں کی غارت گری سے جو کچھ بچا تھا۔ ہندوؤں کے قبضے میں جانا شروع ہوا۔

۱۸۸۶ء میں ایک انگریز نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اس ادارہ کے ذریعے بھیک مانگیں تاکہ ان کے کچھ مطالبات وقتاً فوقتاً تسلیم کیے جاتے رہیں۔ اور سیاسی گھٹن خطرناک صورت حال نہ اختیار کرے۔

جھکا دی تھی گردن یونہی میں نے رسماً
وہ سچ مچ اٹھا لائے خنجر چنانچہ

ہندوؤں نے آزادی کے خواب دیکھنے شروع کیے۔ اب مسلمانوں کو ابھارنے اور ان میں اور ہندوؤں میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت ہوئی تاکہ کوئی مطالبہ قومی حیثیت نہ حاصل کر سکے۔ کچھ لوگوں کو آمادہ کیا گیا کہ مسلمانوں میں علیحدہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کی تحریک چلائی جائے۔ علی گڑھ میں انگریزوں کی سرپرستی میں کالج قائم ہوا اس میں ایک انگریز پرنسپل رکھا گیا جو فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے میں ماہر تھا۔ انگریزوں کی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف راغب کرنے کی اہمیت ظاہر ہے۔ البتہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ان کو علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا حاصل ہوا۔ وہ ملے جلے کالجوں میں بھی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ یہ یونیورسٹی آکسفورڈ اور کیمبرج سے مقابلہ کرے گی۔ لیکن تجربہ یہ ثابت نہ کر سکا کہ اس ادارے کے تعلیم یافتہ لوگوں کا علمی یا ذہنی معیار ان لوگوں سے بلند رہا جو ملی جلی یونیورسٹیوں

سے پڑھ کر نکلے ۔ نہ ان کی مذہبی معلومات یا اسلامی احکامات کی پابندی دوسروں سے زیادہ ثابت ہوئی۔ ہاں ہندوؤں سے علیحدہ رہنے کی خواہش نے ضرور تقویت پائی۔ ہندو پر مسلمان کا سایہ پڑ جائے تو اس کا دھرم خطرے میں پڑ جاتا ہے مسلمانوں کا ایمان اتنا کمزور نہیں کہ ان کو ہندوؤں سے دُور رہنے کی ضرورت ہو ان کا مذہب تو ہر ایک کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے

کچھ مسلمان رئیسوں اور تعلقداروں کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنائیں۔ اس طرح ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ وجود میں آئی۔ ہندو ، اور مسلمانوں میں تعلیمی اور سیاسی علیحدگی کا سامان پورا ہو گیا۔ ساتھ ہی ہندو اور مسلمانوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے شروع کرائے گئے اور اس آگ کی ابتدا ہوتی جس نے رفتہ رفتہ مسلمانان ہند کی مکمل تباہی کا انتظام کر دیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے مسلمانوں کی ملازمت میں علیحدہ نیابت کا مطالبہ پیش ہوا۔ ہندوؤں کو یہ سخت ناگوار تھا۔ لیکن انگریز نے اُسے خوشی سے منظور کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو تعلیمی اداروں میں اور ملازمت کے لیے دُوسری قوموں سے مقابلہ کی ضرورت باقی نہ رہی اور ان کا ذہنی انحطاط جو پہلے ہی ہو چکا تھا اس طرح مکمل ہُوا۔ ان کی کیفیت رئیسوں کے بچوں کی سی ہو گئی۔ جن کی آرزوئیں محنت اور کوشش سے نہیں صرف ضد اور مچلنے سے پوری ہو سکتی ہیں۔

سیاسی اصلاحات کا سوال پیدا ہوا تو مسلمانوں کی طرف سے جُداگانہ نیابت اور جُداگانہ ووٹ کا مُطالبہ پیش ہُوا۔ ہندو اس کے بھی سخت مخالف رہے۔ لیکن انگریز کے لیے یہ بھی بڑا خوش آئند مُطالبہ تھا اور شاید ان ہی کے اشارے سے

کیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ جھگڑے بڑھانے اور مسلمانوں کو تباہی کی طرف لے جانے کی ایک اور ترکیب تھی جداگانہ حقِ رائے دہندگی اکثریت اور اقلیت کو لڑانے اور اقلیت کو تباہ کرنے کا بہترین حربہ ہے۔ اس طریقِ انتخاب میں جو اکثریت کے خلاف زیادہ سے زیادہ اشتعال انگیز باتیں کرے وہی کامیاب ہوتا ہے۔ اکثریت کتنی ہی فیاض اور دریا دل ہو گالیاں سُن سُن کر مشتعل ہوتی ہے۔ اقلیت، اقلیت ہی رہتی ہے اور اکثریت جو چاہتی ہے کرتی رہتی ہے۔ البتہ اب اس کے فیصلوں میں غصہ اور نفرت بھی شامل ہوتا ہے۔ ہندو اس راز سے خُوب واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب پاکستان کے وجُود میں آنے پر ان کو جداگانہ نیابت اور جُداگانہ حق رائے دہی کی پیش کش کی گئی تو انھوں نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔ میں نے مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کو ہاتھ ملتے دیکھا ہے کہ اگر زبردستی جُداگانہ نیابت مشرقی پاکستان کے ہندوؤں پر ٹھونس دی جاتی تو ملک کے سیاسی حالات پر ان کا اتنا اثر نہ ہوتا جتنا کہ اب ہے، بلکہ اب تک تو وہ سارے کے سارے مشرقی پاکستان سے مار کر نکال دیئے گئے ہوتے۔ یہ مشترکہ حق رائے دہندگی کی برکت ہے کہ مسلمانانِ ہند باوجود ان تمام دقتوں کے جو پاکستان کے وجُود میں آنے سے ان کے لیے پیدا ہو گئی ہیں آہستہ آہستہ اپنے قدم دوبارہ جمانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ان کے ووٹ کی ہر سیاسی جماعت کو ضرورت ہے اور انتخاب میں ہر امیدوار کم و بیش ان کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتا ہے۔

بحسنِ خلق توان کرد صید اہلِ نظر
بدام و دانہ نہ گیرند مرغ دانا را

گو مسلمانوں کی اکثریت خصوصی مراعات کی طالب تھی۔ ان میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ہمت اور حوصلے کی تلقین کرتا اور صلح اور یگانگت کا راستہ دکھاتا اتفاق سے الہلال کے کچھ پرانے پرچے مل گئے ہیں ان میں سے چند اقتباسات یکم ستمبر ۱۹۱۲ء کے پرچے سے ملاحظہ فرمایئے۔

"مسلمانوں کی بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ تعداد کی قلت و کثرت کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ تعداد کو قوی کرنا چاہتے ہیں مگر دلوں کو قوی نہیں کرتے حالانکہ اسلام کی نظر میں تعداد کوئی چیز نہیں ہے ایک مخلص مومن دنیا کے ہزاروں انسانوں پر غالب تھا۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ مخلص ہو کر اب بھی نہ ہو۔"

"یہ تعداد کی قلت اور کثرت کا وسوسہ بھی ہمارے دلوں میں اندر کے نفس کا نہیں ہے بلکہ باہر کے وسوسہ انداز کا ڈالا ہوا ہے اور اب تو ہمارے دائرۂ بدبختی کا محور بن گیا ہے۔ کانگرس میں اس لیے نہیں جا سکتے کہ تعداد کم ہے۔ ہندو مار ڈالیں گے۔ سلف گورنمنٹ کی خواہش میں اس لیے شریک نہیں ہو سکتے کہ تعداد کم ہے۔ ہندو گورنمنٹ ہو جائے گی۔ تعلیم کی خوبی سے انکار نہیں مگر ہمیں معاف رکھیے اس لیے کہ ہندو زیادہ ہیں۔ وہ لکھ پڑھ کر ہمیں ہندوستان سے نکال دیں گے۔۔۔۔۔

اللہ اللہ کیا انقلاب کے تغیرات ہیں۔ خدا کی فوج کا ایک سپاہی بحر و بر کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا تھا۔ آج اس کے کروڑوں آدمی

ہر وقت اپنی موت کو سامنے دیکھتے ہیں۔ جنگ بدر کے وقت تو
خُدا نے ایک مومن کو دس کافروں پر بھاری کیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا
کہ آج تم اپنے سے سہ گنا تعداد سے ہراساں ہو۔ اس میں شک نہیں کہ
جو حالت تم نے اپنی بنا رکھی ہے اس میں ہندوؤں کی میجارٹی کی
کی ضرورت نہیں خود تم ہی اپنے تئیں برباد کرنے کیلیے کافی ہو۔ ہندوؤں سے توڑنے
کی ضرورت نہیں البتّہ خُدا سے ڈرنا چاہیے۔ ... تُم کو ہندوستان
میں رہنا ہے تو اپنے ہمسایوں سے معانقہ کر لو اور زندہ رہنا ہے
تو ان سے الگ رہنے کا نتیجہ دیکھ چکے۔ اب ان سے مل جاؤ۔ اگر
ان کی طرف سے رکاوٹ ہے تو اس کی پروا مت کرو.....،،

ہمّت، اعتدال پسندی اور میانہ روی کا مشورہ کبھی مقبول نہیں ہوتا ہے
خصوصاً جب ایک تیسرا فریق جذبات کے بھڑکانے میں دلچسپی رکھتا ہو
انگریزوں نے مسلمانوں کی ہمّتیں توڑ دی تھیں۔ ان کا ایمان متزلزل کر دیا تھا۔ ان
کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔ انگریزی سیاست ان میں سے چند ممتاز
لوگوں کو اپنا آلہ کار بناتے ہُوتے تھی۔ اصل تباہ کرنے والوں کو یہ بھُول چکے
تھے صرف ہندوؤں کا خوف ان پر طاری تھا۔ خوف اور نفرت لازم و ملزوم ہیں
یہ اپنے بزرگوں کی تعلیم فراموش کر چکے تھے۔ جنھوں نے انسان دوستی کا درس دیا
تھا اور سکھایا تھا کہ جو خُدا کی وحدت کا قائل ہے وہ دنیا کی کسی طاقت سے بھی
خوفزدہ نہیں ہوتا اب ان میں سے جو اُٹھتا محبّت اور میل جول کا طالب نہ ہوتا بلکہ
ہندوؤں کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھارتا۔

شب کہ صحبت زحدیث سرِ زلف تو گزشت
ہر کہ بر خاست زجا سلسلہ بر پا بر خاست

پہلی جنگِ عظیم کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ آپس میں اتحاد ہو گیا۔ تحریکِ خلافت اور تحریک کانگرس ساتھ ساتھ چلیں اور ہندو اور مسلمان مل کر اس میں بڑے جوش و خروش سے شریک ہوئے۔ لیکن دونوں کے مقاصد مختلف تھے۔ ہندو آزادئ ملک کے لیے لڑتے تھے۔ مسلمان ٹرکی کے عثمانیہ خاندان کی حکومت قائم رکھنے کے لیے بے چین تھے اور انگریزوں کو اس مقصد کے حصول کی راہ میں حائل سمجھتے تھے۔ عثمانیہ سلطنت وہ سلطنت تھی جو مدت سے مفلوج ہو چکی تھی اور یورپ کے مردِ بیمار کے نام سے مشہور تھی۔ گو اسلام کے اصولوں کی رُو سے اس کا دعویٰ خلافت اس وقت بھی مشکوک تھا جب اسکی طاقت عروج پر تھی اس طاقت کے خاتمے کے بعد تو اس کا تذکرہ بھی مضحکہ خیز ہو کر رہ گیا تھا۔ عثمانیہ خاندان کے دعویٰ خلافت کی اصولی اور تاریخی حیثیت کچھ بھی ہو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب مسلمانانِ ہند ان کی خلافت قائم رکھنے کے لیے اپنی جانیں دے رہے تھے اس وقت عرب ممالک اپنے کو ترکوں کی حکومت سے علیحدہ کر چکے تھے اور خود ترک، مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں سلطان عبدالحمید کو تخت سے اتار چکے تھے اور کسی قیمت پر ان کی حکومت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ تحریکِ خلافت اور کانگرس کے رہنماؤں کو جب انگریزوں نے پکڑ لیا تو دونوں تحریکیں سرد پڑ گئیں۔ مسلمانوں کے سامنے اب وہ مقصد نہ رہا جس نے انھیں ہندوؤں کے ساتھ دوبارہ متحد کیا تھا۔ انگریزوں نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور آریہ سماج اور تبلیغ کی تحریکوں پر روپے پانی کی طرح

بہانے شروع کیے۔ دونوں مذاہب کے پیرو ایک دوسرے سے پھر جدا ہونا شروع ہو گئے۔ اصلاحات اب ناگزیر ہو چکی تھیں۔ انگریزوں کے قدم ڈگمگا چکے تھے۔ ہندوستان کے لیے حقِ خود اختیاری سے انکار کی اب ان میں ہمّت نہ تھی مسلمان اس فکر میں تھے کہ اگر جمہوری طرز پر حکومت بنی تو وہ ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے۔ اور ہزار سال کی حکومت کا تاوان ادا کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اپنے تحفظ کے لیے انھوں نے طرح طرح کے مطالبات شروع کیے۔ کانفرنسیں ہوئیں۔ مدّت تک گفت وشنید جاری رہی۔ جہاں خوف اور بے اعتباری کا دَور دورہ ہو وہاں سیاسی حل کا کیا سوال۔ ہندو مسلم مسئلہ کا حل تو صرف اعتبار یگانگت اور رواداری کی بنا پر ممکن تھا۔ اسے انگریز کب کا تباہ کر چکے تھے۔ اس لیے نہ کوئی حل نکل سکتا تھا نہ نِکلا۔ جو حل نکالا گیا اس سے مسلمانوں کا اتحاد تباہ ہوا اور آپس میں قتل و خُون کے اسباب فراہم ہُوتے۔

تاثیرِ آہ و نالہ مسلم و بے مترس
مارا ہنوز عربدہ باخویشتن بسے است

مسلمان سیاسی رہنماؤں میں اکثر مقتدر ہستیاں پہلے کانگرس میں شریک تھیں۔ قائداعظم محمد علی جناح بھی پہلے کانگرسی تھے اور چاہتے تھے کہ کانگرس کے ذریعے ہی مسلمانوں کے تحفظ کا انتظام کریں۔ جب اس میں کامیابی نہ ہُوئی تو انھوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کچھ دنوں بعد مسلم لیگ میں شریک ہو گئے اور اپنی بے پناہ قابلیت اس کی تنظیم پر خرچ کرنی شروع کی

علاّمہ اقبال مسلمانانِ عالم کے اتحاد کے حامی تھے اور مسلمانانِ ہند کو ہمّت اور شجاعت کی تلقین کرتے رہے۔ ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ ان کو خیال آیا کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ باقی ہندوستان کے مسلمانوں سے الگ رہیں۔ ان کی اور سر عبداللہ ہارون کی قیادت میں اپر انڈیا مسلم کانفرنس کی بنیاد پڑی جس کا مقصد شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ تھا۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الٰہ آباد کے اجلاس میں علاّمہ اقبال نے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے صوبوں کو ملا کر الگ حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی۔ ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے انگلستان میں قیامِ پاکستان کا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ دروغ بر گردن راوی، سنا ہے کہ یہ سرکارِ برطانیہ کے اشارے پر تھا۔ یہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے جداگانہ مفاد کے تحفظ کی ترکیب تھی۔ لیکن مسلمانانِ ہند اس خوش فہمی میں رہے کہ یہ ان کی نجات کا ذریعہ ہے۔ بہر صورت قائدِ اعظم نے اس خیال کو اپنایا اور اس کے ذریعہ سے مسلمانانِ ہند کے دلوں میں نئی امیدیں جگا دیں۔ انھوں نے مطالبۂ پاکستان کی بنا اس نظریہ پر رکھی کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں۔ ان کے لیے علیحدہ علیحدہ ملک ہونے چاہئیں۔ اس دلیل میں قوم اور ملت کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ مفکرین نے قومیت کی بنا نسل، زبان، آبادی، جغرافیائی حدود اور معاشیاتی نظام میں ہم آہنگی رکھی ہے، مذہب کی بنا پر مختلف قومیت کا دعویٰ بنا تھا۔ اگر یہ درست ہو تو انگریز مسلمان انگریزی قومیت نہیں رکھ سکتے۔ روس اور چین کے مسلمانوں کو اپنے لیے علیحدہ علیحدہ ممالک

بنانے چاہئیں۔ ملتِ اسلامیہ اور چیز ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جس میں تمام دنیا کے مسلمان منسلک ہیں، خواہ وہ ایسی جگہ رہتے ہوں جہاں وہ اقلیت میں ہیں خواہ ایسی جگہ ہوں جہاں ان کی اکثریت ہے۔ یا وہ حکمران ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ کچھ جیّد مذہبی رہنما تحریک پاکستان سے علیحدہ رہے۔ اور غدّار اور ہندوؤں کے ایجنٹ کہلائے۔

حصول پاکستان کے فوراً بعد قائد اعظم نے دو قومی نظریہ کو خیر باد کہا اور پاکستان اور ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک قوم قرار دے دیا۔ اس طرح پاکستان کا فلسفہ اپنے صحیح روپ میں ظاہر ہوا۔ یعنی شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا مفاد۔ لیکن ملت کو تباہ کر کے کوئی ایک طبقہ پنپ نہیں سکتا۔ پچیس برس گزرنے پر بھی مستحکم پاکستانی قومیت وجود میں نہیں آسکی۔ ایک صوبہ علیحدہ ہو گیا۔ دوسروں میں علیحدگی کا مطالبہ شروع ہو چکا ہے۔ پاکستان بنا تو مسلمانان ہند جو ایک قوم ہونے کے دعویدار تھے دو قوموں میں تقسیم ہو گئے۔ یعنی ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان۔ اب یہ دو مسلمان قومیں تین بن چکی ہیں یعنی بنگلہ دیشی، ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان۔ اندیشہ ہے کہ یہ تین قومیں جلد ہی چھ ہو جائیں گی۔

تقسیم ہند کے مطالبے پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں لڑائیاں زیادہ بڑے پیمانے پر شروع ہوئیں۔ جہاں فسادات میں دس یا پانچ مسلمان، اور اسی قدر یا اس سے زیادہ ہندو مارے جاتے تھے، وہاں مرنے والوں کی تعداد ہزاروں

تک پہنچنے لگی۔ ان فسادات نے ملک کی تقسیم کو ناگزیر بنا دیا۔

تقسیم کے وقت قتل و غارت گری کی ایسی آندھی چلی کہ بے شمار مسلمان خانماں برباد ہوئے۔ جنھوں نے پاکستان آنے کی کوشش کی لاکھوں کی تعداد میں مارے گئے۔ جو ہندوستان میں رہ گئے ان کی کمر ٹوٹ گئی، اس لیے کہ جن لیڈروں پر انھوں نے اعتماد کیا تھا وہ ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے، یا حکومت کا شوق ان کو یہاں کھینچ لایا۔

جو جیتے جی پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے متعدی امراض کا شکار ہوئے اور مفلسی سے اب بھی مر رہے ہیں۔ جو زندہ رہ گئے اور معاشی خوش حالی بحال کرنے میں کامیاب ہو گئے، صوبائی اور لسانی تعصب کی بنا پر قتل ہوتے ہیں۔ پھر ان کے دلوں پر ماں باپ، بھائی بہن، عزیزوں اور دوستوں کی جدائی کے ایسے زخم ہیں جو کبھی مندمل نہیں ہو سکتے۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

نفرت کے جذبات ایک مرتبہ مشتعل ہو کر قابو میں نہیں آتے۔ اس کی تسکین کے لیے اب ہندو نہیں ملتے تو ہم آپس ہی میں ایک دوسرے کو قتل کر کے جی بہلاتے ہیں۔ اور اس میں لاٹھیوں اور تلواروں کی جگہ ٹینک اور ہوائی جہازوں کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی۔ حساب کیا جائے تو مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان مرنے والوں کی تعداد ہندوؤں کے ہاتھوں مارے جانے والوں سے کئی گنا زیادہ نکلے گی

سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ خون سے ہاتھ رنگنے اور لوٹ مار کی عادت ڈالنے کی بدولت جھوٹ، بے ایمانی، دھوکہ دہی، گروہ بندی، رشوت ستانی، دولت پرستی، قتل و غارت، غرضیکہ ہر وہ طرزِ عمل جو اسلام کی تعلیم سے دور لے جاتے، قومی شعار بن چکا ہے۔

اے کہ دائم ہوس سوختن ما می کرد
کاش می آمد و از دور تماشا می کرد

اس عالم گیر بربادی سے فائدہ سرکاری ملازموں کو ہُوا۔ یہ ایسے مراتب پر پہنچے جو ہندوستان میں ان کے خواب و خیال میں نہ آسکتے تھے اور ان اختیارات کے مالک ہُوتے جو شاید ہی دُنیا میں کہیں سرکاری ملازموں کو حاصل ہوں، فائدہ ان تاجروں کو ہوا جو معمولی دکاندار سے بڑھ کر صنعت کار بن گئے۔ انھوں نے سرکاری ملازمین کے ایمان کو خریدا۔ اور ہوش رُبا گرانی پیدا کر کے ملک کی ساری دولت اپنے قبضہ میں کی۔ اور فائدہ ان لوگوں کو ہُوا جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ملک سے غدّاری کر کے انگریزوں سے وہ مراعات حاصل کی تھیں جن کی بدولت وہ ملک کے حاکم ہونے کے مدعی ہوتے لیکن یہ معدودے چند اشخاص کا طبقہ جس تیزی سے اُبھرا تھا اسی تیزی سے بربادی کی طرف جا رہا ہے۔ اپنے مفاد کے لیے یہ لوگ سیاسی استحکام اور معاشی ترقی کو بہانہ بنا کر ملک کو تباہ کرتے رہے اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ" (یہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔)

مے خوردن وشاد بودن آئین من است
فارغ بودن زکفر و دین، دین من است
گفتم بہ عروسِ دھر کہ کابین تو چیست
گفتا دلِ خرم تو کابین من است

شادی کے بعد ۱۹۴۶ء تک زندگی بہت خوش گوار رہی۔ گو کئی تبادلے ہوئے اور تبادلوں میں بہت پریشانی ہوتی ہے لیکن جہاں پہنچتا چند ہی دنوں میں زندگی معمول پر آجاتی۔ یہ عام سرکاری افسروں کی زندگی تھی۔ پابندی سے دفتر پہنچتا۔ کیا مجال کہ کبھی پانچ منٹ کی بھی دیر ہوجائے شام کو ٹینس یا گالف اور برج۔ کبھی کلب میں کبھی گھر پر۔ اس معمول میں فرق آتا تو صرف دوروں کے زمانے میں۔ ہر سال کشمیر کی سیر ہوتی۔ کبھی پندرہ دن کے لیے، کبھی دو مہینے کے لیے، ہندو احباب اکثر ساتھ ہوتے۔ کبھی کبھی چھٹیاں شملہ یا کراچی میں بھی گزرتیں۔ اس وقت کراچی میں ایسی سکون کی فضا تھی کہ رخصت گزارنے کے لیے شملہ کا مدِمقابل سمجھا جاتا۔ جو لوگ برسات میں چھٹیاں لیتے وہ اکثر وہیں جاتے۔ دفتر میں چھٹیاں بہت ہوتیں اور کرسمس میں دس دن کے لیے دفاتر بند رہتے۔ دسہرا اور ہولی دیوالی میں کئی کئی دن چھٹیاں ہوتیں۔ ان میں الٰہ آباد جایا کرتا۔ سستا زمانہ تھا۔ ہر ہفتہ دعوتیں ہوتیں جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ کبھی کبھی انگریز افسر بھی شریک ہوتے۔ بعض ہندو متعصب بھی تھے۔ لیکن رفاقت اور دوستی کا دور دورہ

تھا۔ افسروں میں اختلافِ مذہب کے باوجود گہری دوستی تھی۔ سیاست میں شرکت سرکاری ملازمین کے لیے ممنوع تھی۔ لہذا سیاسی جھگڑوں کی نہ پروا ہوتی نہ ان پر توجہ۔ اس عرصے میں مَیں ریلوے کی کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹی کا سیکرٹری مقرر ہوا۔ ہندو خواہ مزدور ہو یا کلرک ہمیشہ کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے سوسائٹی میں جمع کراتا مسلمان ہمیشہ قرض لینے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہمیشہ اختلاف رہتا۔ ہندو چاہتے تھے کہ سُود کا نرخ زیادہ ہو تاکہ ان کو منافع میں زیادہ حصّہ ملے۔ مسلمان اس کوشش میں رہتے کہ سُود کا نرخ کم ہو۔ اس طرح براہ راست تصادم رہتا۔ یہ دونوں نقطۂ نظر آپس میں اتنے مختلف، اور متضاد تھے کہ ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ بہرصورت اس کام کی وجہ سے مسلمان مزدوروں میں بہت مقبول ہو گیا۔ ایک مرتبہ مزدوروں کی طرف سے زبردست مظاہرہ ہوا۔ بیس پچیس ہزار آدمیوں نے ریلوے دفتر کو گھیر لیا۔ نعروں سے در و دیوار ہلنے لگے۔ "ہندو مُسلم سکھ عیسائی آپس میں ہیں بھائی بھائی" "انگریزی سامراج مردہ باد" "مزدوروں کے حقوق تسلیم کرو" جنرل مینجر صاحب گھبرا گئے اور مسلح پولیس طلب کی۔ کچھ لوگ میرے پاس آئے کہ گولی چلنے والی ہے۔ میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ جنرل مینجر کے سامنے حاضر ہو کر منت کی کہ پولیس کو سامنے نہ آنے دیجیے مجھے اجازت ہو تو ان لوگوں کو منتشر کر دینا مشکل نہیں۔ جنرل مینجر صاحب راضی ہو گئے، پولیس کو روک دیا۔ میں بے قابو ہجوم کے سامنے گیا۔ مقرر نہیں ہوں پھر بھی اس خروشان و جوشان مجمع کے سامنے حاضر ہُوا جس کے نعروں سے دل لرزتا تھا۔ گلا سُوکھ گیا لیکن ہمت کی اور سکون کے لہجے میں ان کو سمجھایا کہ جو مطالبات

آپ پیش کرنا چاہتے ہیں جنرل مینجر صاحب تک پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ حتی الامکان آپ کی حمایت کریں گے۔ اب مناسب ہے کہ آپ منتشر ہو جائیں۔ چشم زدن میں غضبناک گروہ کا رویہ بدل گیا۔ مشتاق احمد زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ مظاہرین میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی ایک مسلمان افسر کی سربلندی ان کو مطالبات سے زیادہ عزیز تھی۔ اگر کچھ ہندوؤں یا سکھوں نے مخالفت کی کوشش کی تو مسلمانوں نے انھیں دبا دیا اور مجمع منتشر ہو گیا۔ دوست افسروں نے مبارک باد دی۔ مشتاق احمد زندہ باد کے نعروں کا کئی دن تک نشہ رہا میرے نزدیک یہ بڑی فتح تھی۔

وہ اداے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

دل میرود بہ حلقۂ زلفش بہ پائے خویش
دام آنچناں خوش است وشکار ایں چنیں خوش است

بے فکری اور سکون کی زندگی کب تک قائم رہ سکتی تھی جب ہر طرف آگ پھیل رہی ہو تو شعلوں کی لپیک سے کون محفوظ رہتا ہے۔ پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ سرکاری ملازمین بھی بڑی حد تک عملاً اس میں شریک تھے۔ میں کب تک بچتا۔ رفتہ رفتہ میں بھی اسی رَو میں بہہ گیا۔ ملازمت کی مصروفیتوں سے کہاں فرصت کہ اس تحریک کی باریکیوں پر غور کروں اور سوچوں کہ اس کا نتیجہ اسلام کے لیے کیا ہوگا۔ مسلمانوں کے لیے کیا ہوگا۔ اور خلقِ خدا کے لیے کیا ہوگا۔ یہ تحریک ان صوبوں سے چلی تھی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ پنجاب میں اس کا زور نہ تھا۔ پنجاب میں سردار خضر حیات خاں کی قیادت میں مخلوط وزارت قائم تھی یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مسلم لیگ کے لیے یہاں کی وزارت پر قبضہ کرنا اور تحریک پاکستان کو پنجاب میں مقبول بنانا ضروری تھا۔ ایجی ٹیشن شروع ہوا فضا نعروں سے گونجنے لگی۔ ہر طرف غل تھا "تازہ خبر۔ مرگیا خضر"۔ لیڈروں کی خفیہ کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ایک کمیٹی گرفتار ہوتی تو دوسری خفیہ کمیٹی کام سنبھال لیتی۔

بہت سے لوگ جیل گئے۔ ہوتے ہوتے میر خلیل الرحمان کی باری آئی اور وہ خفیہ کمیٹی کے صدر بنے۔ انھیں ریلوے ملازمین کی مدد کی خواہش ہوئی۔ مجھے خفیہ میٹنگ میں بلایا۔ اُن کے گھر پر بیٹھک میں جلسہ تھا۔ ابھی کارروائی شروع نہ ہونے پائی تھی کہ

پولیس آگئی۔ میر صاحب کی دو بہنیں میری ممانی تھیں اس لیے مجھ سے پردہ نہ تھا۔ مجھے فوراً ان کے پاس بھیج دیا گیا۔ اور باہر سے میر صاحب اور دیگر ممبرانِ کمیٹی کو پولیس گرفتار کرکے لے گئی یہ بھی علم نہ ہوا کہ مجھے کیوں طلب کیا گیا تھا۔ ان کے جیل جاتے ہی دوسری کمیٹی سرگرمِ عمل ہو گئی۔ آخر سردار خضر حیات اس طوفان کی تاب نہ لا سکے۔ اور وہ وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ "یہ انقلاب اے متلون مزاج دیکھ جہاں "تازہ خبر مر گیا خضر" کی صدائیں تھیں وہاں "تازہ خبر آئی ہے خضر ہمارا بھائی ہے"۔ کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ مسلم لیگ کی وزارت بنی۔ اسی کے لگ بھگ سردار شوکت حیات نے مجھے طلب کیا اور کہا کہ سخت فسادات ہونے والے ہیں۔ ان کے لیے ہتھیار جمع کرنے ضروری ہیں۔ یہ صوبہ سرحد سے آئیں گے۔ لیکن ریلوے اسٹاف کی مدد ضروری ہے۔ میں نے لائن اسٹاف کے مسلمانوں کو جمع کیا۔ سب نے انتہائی مستعدی کا اظہار کیا اور قسم کھائی کہ اس کام میں جیل جانا تو کیا جان بھی دینی پڑے تو ثابت قدم رہیں گے۔ کمیٹی بنی فرائض تقسیم ہوئے۔ میں نے حاضر ہو کر سردار شوکت حیات کو تفصیل بتائی۔ انھوں نے کہا فوراً دلّی جاؤ۔ اور لیاقت علی خاں صاحب کو بتاؤ۔ میں دوسرے ہی دن دلّی پہنچا۔ لیاقت علی خاں اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت میں وزیرِ خزانہ تھے۔ غالباً میرے آنے کی اطلاع ان کو پہلے سے تھی۔ کارڈ ملتے ہی فوراً طلب کیا۔ غور سے تفصیلات سنیں۔ مزید ہدایات کا وعدہ کیا اور اخفائے راز کی تاکید کی۔ اسی زمانے میں وزارتِ خزانہ میں میرا تقرر بحیثیت ڈپٹی سیکرٹری کے ہو گیا۔ اور میں لاہور سے دلّی چلا گیا۔ معلوم نہیں میری بنائی ہوئی تنظیم کہاں تک مفید رہی۔ بعد میں وسیع پیمانے پر جو کشت و خون ہوتے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کچھ نہ کچھ ضرور

مدد کی ہو گی۔

ریلوے کو چھوڑ کر رہائش اور خرچ کے مسئلے بہت سنگین بن گئے۔ پھر بھی میرے لیے یہ بڑی ترقی تھی۔ اس سے پہلے ریلوے کا کوئی افسر ہندوستان کی وزارتِ خزانہ میں تعینات نہ ہوا تھا۔ میرے انتخاب پر بڑے جھگڑے ہوئے کئی نام تجویز ہوئے۔ لیکن لیاقت علی خاں مصر رہے کہ میری اور صرف میری خدمات درکار ہیں۔ یہ اصرار میری قابلیت یا میرے اثر کے سبب نہ تھا۔ پاکستان کا وجود میں آنا یقینی ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان افسر وزارتِ خزانہ کا کام سیکھیں۔ اس شعبہ کے ماہرین کی مسلمانوں میں کمی تھی۔ اور اس کمی کو بر وقت پورا کرنا ضروری تھا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لڑائی کی تیاریاں وسیع پیمانے پر جاری تھیں۔ ہندوؤں اور سکھوں میں ایک طرف اور مسلمانوں میں دوسری طرف۔ دونوں پر خوف طاری تھا۔ اس قسم کی تیاریاں خوف ہی پر مبنی ہوتی ہیں۔ وزیروں کے زیرِ ہدایت ہتھیار جمع ہو رہے تھے اور آتشیں اسلحہ تیار کیا جا رہا تھا۔ ایک دن ایک بندوق نما ہتھیار نمونہ کے طور پر لایا گیا۔ حکم تھا کہ آزما کر دیکھو۔ ممتاز حسن، ملک وزیر علی اور میں اس کو لے کر ایک جنگل میں پہنچے۔ مجھے اپنی نشانہ بازی پر ناز تھا۔ یونیورسٹی ٹریننگ کور میں تمغے اور انعامات حاصل کر چکا تھا۔ میں نے کہا مجھے دو۔ کارتوس بھر کر چلانے کو تیار ہوا۔ یہ خیال نہ آیا کہ یہ کچے لوہے کی بنی ہے اور پھٹ بھی سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے میں نے اس کو کندھے پر نہ رکھا۔ اور کمر کے پاس سے ہاتھ ہی میں لے کر چلا دی۔ اس کا بولٹ نکل آیا اور پیٹ میں کوئی چھ انچ لمبا زخم لگا کر دُور جا گرا۔ مجھے چکر آگیا۔ خون میں غلطاں زمین پر گر پڑا۔ ابھی زندگی باقی تھی کہ کندھے پر رکھ کر نہ چلایا۔ ورنہ یہی بولٹ پسلیاں توڑ کر سینہ میں گھس جاتا۔ یا اگر کمر کے پاس سے بھی سیدھا رکھ کر چلاتا تو پیٹ میں داخل ہو جاتا۔ میرے ساتھی مجھے کار پر اُٹھا کر لے آئے۔ ایک قابلِ اعتبار مسلمان ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے مرہم پٹی کی۔ لیاقت علی خاں کو اطلاع دی گئی۔ مجھے رُخصت دلا کر احتیاط سے الٰہ آباد بھیج دیا گیا اندازاً تین ہفتہ میں اس قابل ہُوا کہ دلی واپس جا سکوں

پھر بھی کرسی پر بیٹھنے میں تکلیف ہوتی۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا!
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مطالبۂ پاکستان کی شورش زور شور سے جاری تھی۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ یہ مُطالبہ اصولی طور پر تسلیم ہو چکا ہے اور تفصیلات طے ہو رہی ہیں۔ ۳۰۔ مئی ۱۹۴۷ء کو شجاعت علی حسنی مرحوم نے دلّی میں متعین تمام مسلمان افسروں کو چائے کی دعوت دی تاکید تھی کہ حاضری ضروری ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ کیوں؟ حاضر ہونے پر علم ہوا کہ قائد اعظم، لیاقت علی خاں، سردار عبد الرب نشتر اور چند دیگر بھی تشریف فرما ہیں۔ چائے ختم ہوئی تو اعلان ہُوا کہ قائد اعظم تقریر فرمائیں گے۔ وسیع لان پر ایک طرف قالین بچھا تھا۔ ہدایت ہُوئی کہ سب اس پر بیٹھ جائیں۔ میں عادتاً اس قسم کے موقعوں پر سب سے پیچھے اور دور رہتا ہوں۔ جب قالین کی طرف بڑھنے کی ہدایت ہُوئی تو میں نے اپنے کو سب سے آگے پایا۔ جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا اتّفاق سے یہ جگہ اس صوفہ کی کُرسی کے سامنے تھی جس پر قائد اعظم نے بیٹھ کر تقریر کی۔ لیاقت علی خاں صاحب بالکل میرے برابر تشریف فرما تھے۔ قائد اعظم نے مختصر سی تقریر کی جس میں بتایا کہ پاکستان کا مسئلہ طے ہو چکا ہے اور اب اس کے انتظام اور اس کی ترقی کا بوجھ مسلمان افسروں پر پڑنے والا ہے جنھیں تندہی سے کام کرنا ہوگا۔ مرکزی حکومت کے ملازمین کو اختیار ہوگا کہ خواہ وہ ہندوستانی حکومت کی مُلازمت میں رہیں خواہ پاکستانی حکومت کے تحت چلے آئیں۔ اس میں مذہب یا جائے پیدائش کی قید نہ ہوگی۔ دونوں سرکاریں ان کی تنخواہ اور شرائط ملازمت کے تحفظ

کی ذمہ داری قبول کر چکی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ بنگال اور پنجاب تقسیم ہوں گے۔
ابھی ہماری سرحدیں مغرب میں عارضی طور پر گورداسپور تک ہیں۔ لیکن باؤنڈری کمیشن
جلد ہی کام شروع کرنے والا ہے۔ اور بہت سا مزید علاقہ پاکستان میں آئے گا۔ ملی جلی
باؤنڈری فورس کا بھی ذکر کیا جس کا کام متعلقہ علاقہ میں امن برقرار رکھنا ہو گا۔ میں
نے اس وقت تک قائد اعظم کو نہ دیکھا تھا۔ پہلی مرتبہ ان کی تقریر سُنی۔ تقریر مختصر اور
سادہ الفاظ میں تھی۔ لیکن اس میں کچھ ایسا جادو تھا کہ اس دن سے بیوی بچے، دوست
احباب، صحت اور تفریح سب بھول گیا۔ صرف ایک دُھن سوار رہی کہ میرے سپرد جو
کام ہے اس کو بہتر سے بہتر طریقے سے کس طرح انجام دوں تاکہ ملک کو استحکام
نصیب ہو۔ یہ دھن سالوں قائم رہی اور اس کا اثر صحت اور خانگی حالات پر بھی پڑا۔
تقریر کے اختتام پر لوگوں کو سوالات کرنے کی دعوت دی گئی۔ کسی نے پُوچھا مسلم لیگ
کا اب کیا حشر ہو گا۔ فرمایا مسلم لیگ کیا ہے۔ میں اور ایک اسٹینوگرافر۔ کیوں لیاقت؟
لیاقت علی خاں صاحب نے جواب دیا، جناب بجا فرماتے ہیں۔ اس وقت لیاقت علی خاں
مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے۔ ایک اور سوال کے جواب میں فرمایا کہ ہندوستان کے
مسلمانوں کی آئندہ سے ہندوستانی قومیت ہو گی۔ ان کو پاکستان سے کوئی واسطہ نہ ہو گا۔
یہ سن کر مجھ پر سناٹا چھا گیا۔ پانچ کروڑ مسلمان اس فیصلہ سے ہندوستانی ہوں گے۔ کل
تک ان سے وعدے کیے گئے تھے کہ ان کے لیے نیا ملک بنے گا جو جائے سکون ہو گا۔
اسی وعدے پر ان سے قربانیاں طلب کی جاتی تھیں۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے
جان اور مال قربان کیا۔ آج ان کو ان دو لفظوں سے تباہی کی طرف دھکیل دیا گیا۔ دو
قومیت کے نظریہ کو کیا ہوا۔ پھر خیال ہوا کہ آخر قائد اعظم، لیاقت علی خان اور دوسرے

رہنما بھی ہندوستان کے باشندے ہیں۔ یقیناً یہ ٹھیریں گے اور ان کو سنبھالیں گے یہ امید پوری نہ ہوئی۔ میں اپنے متعلق کسی قدر تذبذب میں رہا، میری ماں، میری بہن، میرے بھائی اور جملہ عزیز واقارب مجبوراً ہندوستان میں رہیں گے۔ بحیثیت مرکزی ملازم کے مجھے پاکستان آنے کا اختیار تھا۔ ان سب کو چھوڑ کر میں پاکستان کیونکر چلا جاؤں؟ لیکن فضا میں وہ جوش وخروش اور اضطراب تھا کہ زیادہ غور کا موقع ہی نہ ملا۔ پھر ہر طرف سے یہ یقین دہانی تھی کہ آنا جانا پہلے کی طرح آزادی سے قائم رہے گا۔ ہر ایک کی زبان پر تھا کہ پاکستان کو تجربہ کار افسروں کی ضرورت ہے۔ بغیر ان کے اس کا نظام قائم نہ ہو سکے گا۔ اس وقت ہر شخص ماں، باپ بچے، دولت، زندگی پاکستان کے نام پر قربان کرنے کو تیار تھا۔ میں اس جذبے سے کب بچ سکتا تھا۔ پاکستان کا انتخاب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماں مریں تو آخری وقت ان کے پاس نہ پہنچ سکا۔ بھائی بہن، بھتیجے، بھانجے بے گانے ہو چکے ہیں۔ رشتے کے پوتی پوتوں کے نام سے ناواقف ہوں۔ یا تو یہ سنتے تھے کہ ہندوستان کے سارے مسلمان ایک قوم ہیں یا اک بارگی ماں، سگے بھائی بہن دوست سب غیر اور دشمن قوم میں شامل ہو گئے۔

دو دن کے بعد قیام پاکستان کا سرکاری اعلان ہوا۔ قائدِ اعظم اور پنڈت جواہر لال نہرو نے ریڈیو پر تقریریں کیں۔ سیکرٹریٹ میں ہر شعبے میں تقسیم شروع ہوئی۔ کمیٹیاں بن گئیں۔ جس کمیٹی میں مجھے رکھا گیا اس کا کام وزارتِ مواصلات کی میز کرسی کاغذ قلم پنسل کی تقسیم تھی۔ سارا سرکاری کام بند ہو گیا۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ فریقین ایک دوسرے سے واقعات چھپانے لگے اور چال بازی سے اپنی جانب کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔ ابھی اسی تحصیل عبث میں مصروف تھا کہ چودھری محمد علی نے بلایا

اور کہا کہ خبریں آ رہی ہیں کہ نارتھ ویسٹرن ریلوے میں حالات بگڑتے جا رہے ہیں تم فوراً آجاؤ اور سنبھالو۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ پاکستان سرکار کی طرف سے جامع اختیارات کا خط لے کر اسی دن روانہ ہو گیا۔ بیوی بچوں کو دلّی ہی میں چھوڑا۔

لاہور پہنچ کر عجب عالم دیکھا۔ مسلمان جوش اور غصّہ میں، ہندو ہراساں و لرزاں۔ کام تو دونوں فریقوں میں سے کوئی نہ کرتا تھا۔ لیکن ہندو کاغذات ضائع کر رہے تھے اور چوری چھپے طرح طرح کا سامان دلّی یا فیروز پور بھیج رہے تھے۔ گو گاڑیاں ابھی چل رہی تھیں لیکن آمدنی مفقود تھی۔ میں بھاگا بھاگا ملتان گیا، کوئٹہ پہنچا۔ کراچی جا کر حالات کا جائزہ لیا۔ ہر جگہ یہی حالت دیکھی۔ مجھ جیسے نااہل کے بس میں نہ تھا کہ اس بدنظمی میں نظام کی صورت پیدا کر سکوں۔ مسلمانوں کو ان کے فرائض یاد دلائے۔ ادھر پیٹھ پھری اور پھر وہی حالت۔ ہندوؤں کو سمجھایا اور ڈھارس دلائی۔ سب بے سود۔ خزانے کا کام ایک ہندو نے ٹھیکے پر لیا ہوا تھا۔ اس نے نوٹس دے دیا کہ میرے آدمی بھاگ رہے ہیں۔ میں یہ کام نہیں سنبھال سکتا۔ مسلمان ٹھیکیدار کہاں ملتا۔ نیا محکمہ بنانا ضروری ہوا۔ ہدایات کے لیے دلّی پہنچا۔ بیوی کو خوف زدہ پایا۔ فساد کی خبریں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے دوسرے ہی دن سامان ریل میں لادا اور ہدایات حاصل کرنے کے بعد بیوی بچوں کو ساتھ لے کر واپس ہوا۔ دو ہی دن کے اندر قتل و غارت شروع ہو گیا اور ریل کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ چند ہی دنوں بعد دلّی میں فسادات کی خبریں ملیں۔ مجھے لودھی کالونی میں سرکاری گھر ملا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس جگہ ایک

مسلمان بھی زندہ نہیں بچا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے بیوی بچے وقت سے نکل آئے۔ دُوسروں پر جو گزری اس پر تاسف کرتا رہا۔

چوں بگذرد نظیری خونین کفن بہ حشر
خلقے فغاں کنند کہ ایں داد خواہ کیست

میرے لاہور واپس پہنچنے کے بعد ہی مغربی پاکستان میں فسادات شروع ہو گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ مسلمان کہتے تھے کہ سکھوں اور ہندوؤں نے لڑائی شروع کی۔ ہندو کہتے تھے کہ مسلمانوں نے۔ حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ یا ان چند لوگوں کو معلوم ہوگی جنھوں نے اس کا انتظام کیا تھا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے بلا تمیز مارے جانے لگے۔ ہر طرف اور ہر شہر میں قتلِ عام تھا۔ مشرقی پنجاب سے خبر آئی کہ ایک ٹرین کے مسافروں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ فوراً ہی گوجرانوالہ میں ہندوؤں اور سکھوں سے بھری ہوئی ٹرین صاف کر دی گئی۔ جواب در جواب کا لامتناہی سلسلہ تھا جو ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ دفتر سے نکلنے میں دیر ہو جاتی۔ باہر آتا تو آسمان ہندوؤں کے جلتے ہوئے مکانوں سے سرخ نظر آتا۔ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے قافلے کے قافلے راستے میں مرتے مردوں کو دفناتے بھاگتے چلے آرہے تھے۔ پاکستان پہنچ کر نیم مردہ، زمین پر گر پڑتے۔ ادھر ہندوؤں کے قافلے بھاگ رہے تھے۔ دونوں کے راہیں بند تھیں۔ باؤنڈری فورس بجائے حفاظت کرنے کے ان پر گولیاں چلاتی تھی۔ اسٹیشن پر فوج تعینات تھی۔ میں خزانے کی دیکھ بھال کے لیے کئی بار وہاں جاتا۔ صرف ایک دن میں آدھے گھنٹے کے اندر اکتالیس آدمیوں کو جان بچانے کی فکر میں بھاگتے ہوئے گولی کھاتے دیکھا۔ ان کی لاشیں کھینچ کر ایک طرف پھینک دی

جاتیں میرا دل تڑپتا کہ ان کو کیسے بچاؤں۔ لیکن بے بس اور لاچار تھا۔ بعض فوجیوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ نہتوں پر، جو جان بچانے کے لیے بھاگ رہے ہوں گولی چلائی جائے۔ میری کون سنتا۔ میں فوجی افسر نہیں تھا، سپاہی مجھ سے بات کرنے کو بھی تیار نہ تھے۔ بعض کو تڑپتے دیکھا۔ پاس گیا ایک سکھ دھیرے دھیرے پانی مانگ رہا تھا۔ میں بھاگا بھاگا دفتر گیا اور ایک گلاس میں پانی لایا۔ قبل اس کے کہ اس کے حلق سے پانی اترے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ قائداعظم کا اعلان تھا کہ غیر مسلم پاکستان میں حفاظت سے رہیں گے۔ حساب کے محکمے میں ان کی سخت ضرورت تھی کچھ لوگ میرے وعدوں اور میری یقین دہانی پر اعتبار کر کے رُکے رہے سب عورتوں اور بچوں سمیت قتل ہوئے۔ صرف دو کی جانیں بچانے میں کامیاب ہُوا۔ ایک نے اپنے بچوں کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھا اور کسی طرح بھاگ کر مجھ تک پہنچا۔ میں نے اپنے کمرے میں اس کو اس وقت تک رکھا جب تک امرتسر جانے والی گاڑی تیار نہ ہوگئی۔ پھر خود اس میں بٹھا کر واپس آیا۔ دوسرے صاحب ریلوے کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ ایک دن پانچ بجے صبح ٹیلیفون کیا کہ گھر میں لوگ گھس آئے ہیں۔ میں فوراً پہنچا۔ دیکھا کہ لوگ گھر لوٹنے میں مصروف ہیں۔ یہ ریلوے ہی کے ملازمین تھے۔ سب مجھے جانتے تھے۔ کسی کو ڈانٹا، کسی کو سمجھایا۔ لوگ چلے گئے۔ میں نے کسی طرح ایک پولیس کانسٹیبل کا انتظام کیا اور اس کی ڈیوٹی لگا کر واپس ہُوا۔ میری پیٹھ پھرنی تھی کہ کانسٹیبل ٹہلتا ہوا دُوسری طرف چلا گیا۔ ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ ٹیلیفون دوبارہ بجنا شروع ہُوا۔ معلوم ہوا کہ کانسٹیبل غائب ہے اور لوٹ مار کرنے والے پھر گھس آئے ہیں۔ میں واپس گیا۔ مجھے دیکھتے ہی لوگ پھر منتشر ہو گئے۔ لیکن ان

صاحب نے میری منت کی کہ اب مجھے یہاں اکیلا نہ چھوڑیئے گھر لٹتا ہے لٹ جائے۔ میری جان بچایئے۔ میں ان کو اپنے ساتھ لے آیا۔ میرا اپنا گھر نہ تھا۔ ایک عزیز دوست اور اعلیٰ افسر کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے دوست نے اس غریب کو دیکھا یہ ان کا بھی پرانا دوست تھا۔ پھر بھی ایک ۲۲ بور کی رائفل نکال لاتے اور اس کے سامنے نشانہ بازی کی مشق شروع کی گو اس رائفل کی آواز چنداں زور کی نہ تھی پھر بھی جتنی دفعہ چھوٹتی غریب پناہ گزین کا چہرہ زرد ہو جاتا۔ میرے دوست نے مجھے بلا کر کہا کہ اس کی جیب میں رُوپے بھرے ہُوئے ہیں۔ اس سے کہہ دو کہ رکھ دے۔ مارنے پیٹنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایک اشارہ کافی ہے۔ میں نے کہا کہ مروت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ فرمایا کہ دوسری طرف چلے جاؤ میں خود ہی سمجھ لوں گا۔ میں نے کہا آپ کے ہاتھ میں رائفل ہے پہلے میرا خاتمہ کیجیے پھر روپے پر قبضہ کیجیے۔ اس پر میرے دوست چپ ہو گئے۔ اب میری جُراَت نہ تھی کہ پناہ گزین کو چھوڑ کر غسل خانے بھی جاؤں۔ آخر اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر ریل پر سوار کرا آیا۔ اعلیٰ افسروں میں رذالت کی یہ واحد مثال نہ تھی۔ لوگوں کو بھی دیکھا کہ پرانے جاننے والوں کو گھر سے نکالا اور ان کے گھر اور مال و دولت اس طرح ہضم کر گئے کہ ڈکار نہ لی۔ ہر طرف بربریت کا وہ منظر تھا کہ مجھے اپنے مسلمان ہونے پر شرم آنے لگی۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی یہی بربریت جاری تھی۔ اسی طرح مسلمان عورتیں، بچّے، بوڑھے اور نہتّے قتل ہو رہے تھے۔ لیکن من از بے گانگان ہرگز نہ نالم۔ سکھ ایک وحشی قوم ہے۔ جس کو ایک مسلمان بادشاہ نے چند خدمات کے عوض پنجاب کی حکومت انعام میں دے دی تھی۔ اس سے ان کے جنگی ہونے میں نہ فرق آیا نہ آسکتا تھا۔ ہندو کافر قوم ہے ان کے پاس نہ اللہ کے احکام

نہ رسولؐ اللہ کی سُنّت اور نہ رسولؐ کے خلفاء کی روایتیں۔ ہزار برس کی غلامی نے ان کے دلوں میں نفرت اور عداوت کے سوا کسی چیز کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ لیکن مسلمانوں کو کیا ہوا تھا کہ اپنے فرائض اور اپنی روایات کو بھول کر درندگی پر اُتر آئے۔ خلیفہ اوّل نے غیر ممالک کے خلاف پہلی فوج بھیجی تو تاکید کی کہ خیانت نہ کرنا، بدعہدی نہ کرنا، چوری نہ کرنا، مقتولوں کے اعضاء نہ کاٹنا۔ بچے بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ مسلمان ہمیشہ اس پر قائم رہے۔ صلیبی جنگوں میں عیسائی کسی شہر کو فتح کرتے تو کسی بچے بوڑھے اور کسی عورت کو زندہ نہ چھوڑتے۔ لیکن مسلمان جب کوئی شہر فتح کرتے تو اپنے مقتول اور ظلم رسیدہ بچوں اور عورتوں کا انتقام مفتوحہ علاقہ کے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سے نہ لیتے۔

اللہ کا حکم ہے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا

"عہد وفا کرو یقیناً عہد کے متعلق باز پرس ہو گی۔"

ہم نے ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ وہ بحیثیتِ ذمّی ہمارے پاس حفاظت سے رہیں گے۔ لیکن جن لوگوں نے اس وعدہ پر اعتبار کیا اور یہاں رہنا چاہا ان کو مع عورتوں اور بچوں کے قتل کر دیا۔ دلی میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا تو جواہر لال نہرو پاگلوں کی طرح سڑکوں پر بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ پاکستان میں ذِمّیوں کے قتلِ عام میں مَیں نے کسی مسلم لیگی رہنما کو ان کی حفاظت کی کوشش میں اُنگلی ہلاتے نہ دیکھا۔

رسُولؐ اللہ نے فرمایا تھا۔

"لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں اللہ

ان پر عذاب عام بھیج دے۔"

ہندوؤں کے خون سے ہاتھ رنگنے اور ان کی املاک پر قبضہ کرنے کے بعد اب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے قتل میں مصروف ہیں۔ جھوٹ، بے ایمانی، دھوکہ دہی گروہ بندی، رشوت ستانی، دولت پرستی اور ہر وہ طریقہ جو تباہی کی طرف لے جاتے قومی شعار بن چکا ہے۔ قوم ایک عذاب الٰہی میں مبتلا ہو چکی ہے جس کا علاج انسانی دسترس سے باہر ہے۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر در پس امروز بود فردائے

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

ابھی پنجاب میں قتل و غارت جاری تھا۔ نئے محکمہ کی تنظیم نامکمل تھی۔ لیکن کراچی سے ٹیلیفون پر ٹیلیفون آنا شروع ہوئے کہ جلد پہنچو۔ مجبوراً کام نیم مکمل چھوڑ کر روانہ ہوا۔ ابھی ٹرینیں نہ باقاعدہ طور پر چلنی شروع ہوئی تھیں اور نہ محفوظ سمجھی جاتی تھیں۔ بھاگتے قافلے، جلتے دیہات، بے گور و کفن لاشیں اور غارت گروں کے انبوہ گاڑی سے نظر آتے تھے۔ ٹکٹ کوئی نہ خریدتا۔ فرسٹ ہو یا سیکنڈ۔ لوگ گاڑی میں بھرتے چلے آتے اور ان کو روکنے والی کوئی طاقت نہ تھی۔ کراچی پہنچا تو وہاں بھی نفسی نفسی کا عالم دیکھا۔ نہ رہنے کی جگہ نہ کام کرنے کو دفتر نہ لکھنے پڑھنے کے لیے فائلیں۔ جو لوگ اس دور سے گزرے ہیں۔ ان ہی کا دل جانتا ہے کہ کن دقتوں سے پیپر جمے اور کن مشقتوں سے باقاعدہ کام شروع ہوا۔ شہر مہاجرین سے بھرا تھا۔ ان کو ٹھکانے کی تلاش تھی ہندوؤں کی لوٹ مار جاری تھی اور ان کے مکانوں پر قبضہ ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں مہاجرین کی آپس میں بھی لڑائیاں ہوتیں۔ ہزاروں شریف خاندانوں نے جہاں کھلی جگہ پائی چادروں کی آڑ کھڑی کر کے پناہ لی۔

میں خوش قسمت تھا۔ مجھے سرکاری مکان ملا۔ لیکن ریلوے کے مکانوں میں رہ کر عادتیں بگڑ چکی تھیں۔ اس لیے بہت تکلیف دہ معلوم ہوا۔ اعزہ گھر چھوڑ چھوڑ کر الہ آباد سے آ رہے تھے۔ جو آتا ساتھ ٹھہراتا۔ چھوٹی سی جگہ میں تیس تیس چالیس چالیس

آدمی مہینوں رہتے رہے۔ لیکن جب میدانوں میں پڑے پناہ گزینوں کو دیکھتا تو خدا کا شکر بجا لاتا۔ ان کے لیے چلچلاتی دھوپ سے پناہ نہ تھی۔ بارش ہوتی تو ان کے پلنگ پانی میں تیرتے۔ سردی کی خشک اور گرد آلود ہوائیں ان کو ستاتیں۔ یہ وبائی امراض سے مکھیوں اور مچھروں کی طرح مر رہے تھے۔ لاکھوں پناہ گزین سالوں اسی حالت میں رہے۔ ان کے رہنما بھی بیشتر یہاں پہنچ چکے تھے۔ لیکن وہ اپنی سازشوں اور اپنے لیے دولت جمع کرنے میں مصروف تھے۔ ان غریبوں کی پرورش کا نہ ان کو ہوش تھا نہ اب اس کی ضرورت باقی تھی۔ کہتے ہیں بارہ برس بعد گھورے کے دن بھی پھرتے ہیں۔ اس مدت کے گزرنے پر عہد ایوبیہ میں ان کی آبادکاری کی کچھ کوششیں ہوئیں۔ لیکن جب ایوب خاں صدارت کے لیے منتخب ہونے کے امیدوار ہوئے تو مہاجرین نے ان کو ووٹ نہ دیا۔ اس گناہ کی پاداش میں پٹھانوں کو مسلح کر کے ان پر چھوڑ دیا گیا۔ جو جھونپڑیاں مدت کی تکلیف و مشقت کے بعد بنائی تھیں ان میں آگ لگا دی گئی۔ اور ان کے بچوں اور عورتوں سے وہ سلوک کیا گیا جو ہندوؤں کو بھی کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے وطن سے
واقف ہے مسافر کا دل اس رنج و محن سے
چھٹتا نہیں گھر جان نکل جاتی ہے تن سے
آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

شبلی بیا کہ گرمی بازارِ بمبئی !
امسال نیز ہست بہ رنگے کہ پار بود

مرکزی حکومت کے تمام ملازمین کو حق دیا گیا تھا کہ چاہیں وہ ہندوستان میں رہیں چاہیں پاکستان چلے آئیں۔ قریب قریب تمام مسلمان ملازمین نے پاکستان آنا منتخب کیا۔ ان میں ہزاروں ریلوے ملازمین بھی تھے۔ مشرقی پنجاب کے راستے ہنگاموں کے سبب بند ہو چکے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کو بمبئی کے راستے آنا پڑا۔ ان کی مدد کے لیے بمبئی میں ایک افسر مقرر کیا گیا۔ یہ کام مدت تک مکمل نہ ہو سکا۔ اوائل جنوری ۱۹۴۸ء میں مجھے حکم ملا کہ جاؤ اور اندازہ کرو کہ ابھی کتنے دن اور درکار ہیں۔ اور جو دقتیں ہوں ان کو رفع کرو۔ اس طرح تیرہ برس کے بعد بمبئی پھر پہنچا۔ بمبئی کی گرمی کا وہی عالم تھا۔ بھیڑ اور ہنگامہ پہلے سے زیادہ۔ لیکن اس کو میرے دل کی افسردگی پر محمول کیجیے یا عمر کا قصور۔ پہلی سی رونق نظر نہ آئی۔ ہر چیز بوسیدہ اور تنزل پذیر معلوم ہوتی تھی اور ہر طرف اس انتشار پر نظر پڑتی جو انگریزوں کی حکومت میں نہ تھا۔ یا یوں کہیئے کہ اس وقت نہ تھا جب میں بمبئی میں رہتا تھا۔ پرانے ہندو اور مسلمان دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ سب میں وہی محبت اور خلوص پایا جس کی بچھڑے ہوتے دوستوں سے توقع ہوتی ہے۔ مسلمان پاکستان کے لیے دستِ بدعا تھے اور کہتے تھے کہ ہم پر جو گزرے گی گزرے لیکن ہمارے دل کی راحت اس میں ہے کہ پاکستان پھلے پھولے اور ترقی کرے۔ ان کی باتیں سن کر اکثر رونا آتا۔ ہندو کہتے کہ سگے بھائی بھی

بڑھ کر اپنا علیحدہ گھر بنا لیتے ہیں۔ پھر بھی بھائی بھائی ہوتا ہے۔ ہندو مسلمان ایک دھرتی سے پیدا ہوئے اگر مسلمان الگ گھر چاہتے ہیں تو پھر بھی وہ ہمارے بھائی ہیں۔

ایک دن کچھ ہندو دوستوں نے تاج محل ہوٹل میں چائے پر مدعو کیا۔ غسل خانے جانے لگا تو راستے میں ٹیلی پرنٹر پر نظر پڑی۔ اس میں گاندھی جی پر گولی چلنے کی خبر آ رہی تھی۔ میں نے آکر دوستوں کو بتایا سب پر سناٹا چھا گیا تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوا کہ زخموں کی تاب نہ لاکر گاندھی جی سورگ باشی ہو گئے۔ ہم وہاں سے اُٹھ کر ان میں سے ایک کے گھر چوپاٹی گئے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اب جو نکلے تو ہر طرف ہجوم تھا سواریاں سڑک پر نہ نکل سکتی تھیں۔ میں وکٹوریہ ٹرمینس پر مقیم تھا۔ احباب نے اصرار کیا کہ اس وقت مت جاؤ لیکن میں نہ مانا اور پیدل چل پڑا۔ راستے میں ہندو محلے پڑتے تھے شروع میں تو اتنا احساس نہ ہوا۔ لیکن کچھ دور جا کر ہنگامے کی کیفیت نظر آئی۔ لوگ بھاگے بھاگے پھرتے تھے ہر طرف پولیس تھی۔ دیکھتے دیکھتے آرمرڈ کار آگئی۔ خطرے کے احساس سے پسینہ آنے لگا۔ خیال ہوا کہ یہاں سراسیمگی کا اظہار کیا تو خیر نہیں۔ خاموشی سے اپنے راستے پر چلتا رہا۔ ہانپتا کانپتا اسٹیشن پہنچا تو وہاں مسلمانوں کا ہجوم دیکھا جو ایک پاکستانی افسر کی حفاظت کی فکر میں جمع تھے۔ یہ لوگ مجھے بھنڈی بازار لے گئے یہاں مسلمانوں نے باقاعدہ قلعہ بنا رکھا تھا۔ رات کے دس بجے تک بڑی اضطرابی حالت رہی۔ کیوں کہ یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ گاندھی جی کو مارنے والا مسلمان ہے۔ اس افواہ سے ہندو مسلم فساد کا اندیشہ تھا۔ پھر خبر آئی کہ مارنے والا سکھ تھا۔ اور کچھ سکھ مارے بھی گئے۔ دس بجے ریڈیو پر اعلان ہوا کہ قاتل جن سنگھی ہندو ہے۔ اس پر مسلمانوں نے اطمینان کا

سانس لیا۔ جن سنگھیوں کے گھروں پر حملے شروع ہو گئے اور مسلمان تماشہ دیکھتے رہے۔ میں گاندھی جی کی زندگی اور موت پر غور کرتا رہا۔ آزادی سے پہلے ان کے لیے دنیا کی تمام دولت اور ہر طرح کی آسائش موجود تھی۔ انھوں نے سب ٹھکرا دیا۔ اور ساری عمر یا جیل میں کاٹی یا فقیری میں گزاری۔ فقر و فاقہ کے زور سے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا۔ وہ اگر بادشاہ بننا چاہتے تو عوام ان کو سونے اور ہیرے سے لاد دیتے۔ لیکن انھوں نے اس میں اپنی عزت نہ سمجھی اور ہریجن کالونی یعنی بھنگیوں اور پاسیوں کی آبادی میں رہنا پسند کیا۔ بجائے دوسروں سے خدمت کرانے کے خود اپنا پنجا نہ صاف کرنا پسند کرتے تھے۔ انھوں نے دشمنوں کے ساتھ محبت کرنا سکھایا۔ مسلمانوں نے ان پر کبھی اعتبار نہ کیا۔ لیکن انھوں نے ان کی خاطر فاقے کیے۔ شہر شہر کی خاک چھانی۔ گالیاں کھائیں پتھروں کی بوچھاڑ برداشت کی اور آخر میں اس دُھن میں کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں آرام اور چین سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملے مارے گئے۔ اس مرتبہ کے لوگ انسانی تاریخ میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایسے لوگ مرتے نہیں۔ انسانوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

درچمن پروانہ اے آمد ولے ننشستہ رفت
از حریفاں قہر بے جائے توام آمد بیاد

اللہ غلام محمد صاحب کو اپنی آغوشِ مغفرت میں جگہ دے۔ وزارتِ مال میں مجھے ان کی ماتحتی میں اندازاً پانچ سال ملازمت کا موقع ملا۔ طویل ملازمت کے عرصے میں بہت افسر دیکھے لیکن ان سا سخت گیر اور سخت مزاج پہلے نہ کبھی دیکھا تھا نہ بعد میں دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ میں خوش قسمت تھا کہ میرے ساتھ ایسا اتفاق نہ ہُوا لیکن میں نے دُوسرے افسروں کو ایسی مُغلظات کھاتے سُنا ہے جو صرف نچلے طبقوں کی ہی خصوصیت ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ اگر کسی نے الٹ کر ترکی بہ ترکی جواب دیا تو اسے گلے لگا لیا اور اس سے معافی مانگی۔ لیکن اس کو فیض کبھی نہ پہنچا۔ جس نے گالیاں سُن لیں اور حاضر باشی میں کوتاہی نہ کی آسمان پر پہنچا۔ میں طبعاً عزلت نشین ہُوں۔ خصوصاً اگر کسی کا مجُھ سے بالاتر رتبہ ہو تو اس سے دُور رہتا ہُوں اور اس کے سامنے میری زبان بند ہوتی ہے ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔ نہ کسی کی خوشامد کی نہ کسی کی جی حضوری میں رہا۔ غلام محمد صاحب کو مجھ سے یہ شکایت تھی کہ مشتاق احمد کو میری پروا نہیں۔ جب کئی لوگوں سے یہ شکایت سُن چکا تو فکر ہوئی کہ اس کو رفع کرنا چاہیے۔ ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ رات کے ہوائی جہاز سے لندن تشریف لے جا رہے ہیں۔ دل میں آیا کہ سب افسر رخصت کرنے جائیں گے۔ میں بھی ہوائی اڈے پر حاضری دے آؤں۔ وقت سے پہلے پہنچا۔ دیر تک منتظر رہا۔ تشریف لائے تو مجھے دیکھا۔ فرمایا کہ چوہدری محمد علی کو پہنچانے

آئے ہو گئے۔ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ کوئی جواب سمجھ میں نہ آیا۔ مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ چودھری محمد علی صاحب بھی اسی جہاز سے عازمِ لندن تھے۔ نہ مجھے چودھری محمد علی کا کبھی خیال آیا تھا اور نہ ان سے اس زمانے میں کوئی خاص مراسم تھے۔ اوائل ملازمت میں ان سے کافی نیازمندی حاصل تھی۔ تقسیمِ ہند کے بعد شاید ان سے کبھی مُلاقات بھی نہ ہوئی تھی۔ لیکن غلام محمد صاحب کو ان باتوں سے کیا واسطہ۔ انھوں نے جو دل میں تھا کہہ دیا اور منظورِ نظر لوگوں کے ساتھ وی آئی پی کمرے میں چلے گئے۔ میں اپنا سا منہ لیے ہُوئے گھر واپس ہُوا۔

شکیلؔ ان کی محفل میں بھی کیا ملا اور کچھ بڑھ گئیں دل کی مجبوریاں
سب کی جانب رہی وہ نگاہ کرم ہم ترستے رہے اک نظر کے لیے

اس طرح پاکستان کا یہ بنیادی اصول ذہن نشین ہوا۔ کہ انگریزی دور ختم ہُوا جب سرکاری ملازم سے صرف اپنے کام سے وابستگی کی توقع کی جاتی تھی۔ پاکستان میں ہر سرکاری ملازم کے لیے کسی با اثر ہستی سے وابستگی ضروری تھی اور جو شخص غلام محمد صاحب کے حاضر باشوں میں نہیں یقیناً چودھری محمد علی کا منظورِ نظر ہوگا۔ میں نہ ادھر کا نہ ادھر کا۔ میرے لیے ایسے نظام میں گنجائش کہاں۔ اس کے علاوہ تعصّب بھی سر اُٹھا چکا تھا۔ ابھی بین الصوبائی تعصّب تو زیادہ بلندی پر نہ پہنچا تھا۔ ملازمت میں زیادہ تر مہاجرین اور پنجابی تھے۔ ان دونوں کی رقابت زوروں پر تھی۔ مہاجرین کے لیے تلیر کے لقب کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔ تلیر وہ چڑیا ہے جس کا شکار بہت تفریح کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ قائدِ اعظم کی تقریر کا سحر ہنوز قائم تھا۔ بڑی تندہی سے کام کرتا۔ زیادہ سے زیادہ بوجھ مجھ پر لاد دیا گیا۔ بعض حلقوں میں اس کی داد بھی ملتی۔ لیکن اس معیار پر پورا نہ اُتر

سکا جس کا وقت متقاضی تھا۔ میں نہ پنجابی تھا اور نہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ مورد عتاب رہا۔ دُوسروں کو ترقی کرتے دیکھتا اور خون کے گھونٹ پیتا۔

غلام محمد صاحب نے وزارتِ خزانہ میں کام کرنے کا ایک ایسا اصول بنایا تھا جو زریں حروف میں لکھ کر محفوظ کیا جانا چاہیے۔ گورنمنٹ کا ڈھانچہ غیر مکمل تھا۔ روز نئے اخراجات کی تجویزیں آتی تھیں۔ حکم تھا کہ جو تجویز آتے نامنظور کر کے واپس کر دو۔ اگر واقعی ضرورت ہوگی تو وزارتِ متعلقہ دوبارہ بھیجے گی۔ اب اس پر غور کرو لیکن ضروری نہیں کہ منظور کر لو۔ تیسری مرتبہ آئے تو سمجھو کہ بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔ اب اگر واقعی ضروری سمجھو تو منظور کر دو۔ سرکاری اخراجات کم سے کم رکھنے کی اس وقت ضرورت بھی تھی۔ ہندوستان نے پاکستان کے حصے کے پچپن کروڑ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک وقت تو ایسا بھی تھا کہ ہم سمجھ بیٹھے کہ آئندہ مہینے تنخواہ نہ مل سکے گی۔ وہ تو نظام حیدر آباد نے بیس کروڑ بھیجے تو فوری کام چلا۔ پھر گاندھی جی نے برت رکھ کر ہندوستان کی سرکار کو اس رقم کے ادا کرنے پر مجبور کیا جو ان کے ذمہ نکلتی تھی۔ بعد میں صرف پچاس کروڑ وصول ہُوئے۔ یہ ایسی مشکلات کا زمانہ تھا جو آج تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ صرف غلام محمد صاحب کی سختی اور حسن تدبیر تھی جس نے قوم کو مالی بحران سے نکالا اور ترقی کے راستے پر ڈالا۔

۱۹۴۹ء میں برطانیہ نے اپنے سکے کی قیمت کم کر دی ہندوستان نے برطانیہ کا ساتھ دیا۔ توقع تھی کہ پاکستان بھی یہی کریگا۔ یہ نہ ہوا۔ مشرقی پاکستان کی معاشی زندگی کا انحصار پٹ سن پر تھا۔ اس کے خاص خریدار برطانیہ اور ہندوستان تھے۔ انھوں نے نئی قیمت پر خریداری سے انکار کیا۔ اس طرح سکّے کی قیمت کم نہ ہونے سے مشرقی پاکستان

کے کاشت کار کی تباہی تھی۔ یہاں مغربی پاکستان میں نئی نئی صنعتیں قائم ہو رہی تھیں۔ سکّے کی قیمت غیر فطری طور پر اونچی رکھنے سے اس میں آسانی ہوتی تھی جب ہندوستان نے پٹ سن خریدنے سے انکار کیا تو کاشت کاروں کی مصیبت کم کرنے کے لیے جوٹ بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا کام یہ تھا کہ پٹ سن خرید کر رکھے تاکہ قیمت زیادہ نیچے نہ گرنے پاتے۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ کچھ دنوں بعد کوریا میں جنگ چھڑ گئی اور پٹ سن کے دام اس قدر چڑھے کہ تاریخ میں اس کی مثال نہ تھی۔ اس طرح ایک خطرناک معاشی حالت قابو میں آگئی۔ لیکن مشرقی پاکستان کے غریب طبقے کی مشکلات رفع نہ ہوئیں۔ زائد زرِمبادلہ جو حاصل ہوا۔ ان کی بہبود پر صرف نہ کیا گیا۔ اس سے نئے ہتھیار خریدے گئے۔ شرح مبادلہ کے جھگڑے میں ہندوستان سے تجارت ختم ہوگئی۔ مشرقی پاکستان کا اس تجارت پر بہت انحصار تھا۔

پاکستانی روپے کی غیر فطری شرح مبادلہ قائم رکھنے کے نتائج اتنے دوررس ثابت ہوئے کہ اس وقت کے حکام متعلقہ کے وہم میں بھی نہ آسکتے تھے۔ اس سے مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان غیر متوازن معیشت کی بنیاد پڑی۔ اس نے رفتہ رفتہ ملک کے ایک حصہ کو دوسرے سے بیزار کر دیا۔ خود مغربی پاکستان میں ایسی صنعتوں کو ترقی ملی جن میں مزدوروں کی کم سے کم ضرورت ہوتی ہے اس طرح بیروزگاری بڑھی۔ اسی کی وجہ سے بونس ووچر کی اسکیم ضروری ہوگئی۔ آخر اس اسکیم نے ضروریات زندگی کی قیمتیں اتنی بڑھا دیں کہ عوام کے لیے زندگی دوبھر ہوگئی۔ یہی انقلاب کے راستے ہیں

ان ہی جھگڑوں میں میرا تقرر جوٹ بورڈ میں ہوا۔ میں مالی مشیر کی حیثیت سے گیا تھا۔ لیکن میرے پہنچنے پر بورڈ کے صدر کراچی چلے آئے اور مجھے اکیلا چھوڑ دیا گیا

خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ ۔خود ہی اپنا مشیر بنا رہا اور ساری ذمہ داری سنبھالنی پڑی بار بار کراچی لکھتا رہا کہ میری ذمہ داریاں اور میری حیثیت متعین ہونی چاہیے ۔ایک چپ ہزار بلا ٹالتی ہے ۔کسی خط کا جواب نہ ملا۔

پٹ سن کے دام اتنے چڑھ گئے تھے کہ مجھے افراطِ زر کا خیال ہوا ۔چیف منسٹر کی خدمت حاضر ہوا اور عرض کی کہ ٹیکس لگا کر اس کا سدباب کرنا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس کی یہاں ضرورت نہیں افراطِ زر ہو ہی نہیں سکتا۔جوٹ کے دام بڑھتے ہیں تو جس کے ایک بیوی ہوتی ہے دوسری شادی کر لیتا ہے ۔اس طرح زیادہ تر آمدنی کھانے پینے پر خرچ ہو جاتی ہے اور حساب برابر ہو جاتا ہے میں نے پوچھا کہ دام گرتے ہیں تو کیا ہوتا ہے ۔فرمایا کہ طلاق دے کر بیوی کو باپ کے گھر واپس کر دیا جاتا ہے ۔میں خاموش واپس ہوا ۔خیال آیا کہ دنیا بھر کے ماہرین معاشیات کو افراطِ زر اور قلتِ زر کی بڑی فکر رہتی ہے۔کیوں نہ ان کو دعوت دی جائے کہ یہاں آکر اس کا آسان علاج سیکھ جائیں ۔

جوٹ بورڈ کا حساب کئی سال سے نامکمل پڑا تھا۔مجھ سے کہا گیا تھا کہ چند ہفتہ کی تقرری ہے لیکن جب مکمل کر لو تو فوراً واپس آجاؤ۔بیوی بچوں کو کراچی چھوڑ کر اکیلا نرائن گنج پہنچا تھا۔تنہائی کے سب دن تھے ۔تنہائی کی سب راتیں ۔تین چار ہفتے میں حساب مکمل کر لیا۔

یک بیک وعدہ او راہمہ دیدیم کلیم
نیست یک وعدہ کہ شرمندہ صد فردا نیست

چھ ہفتے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ڈیڑھ سال وہاں رکھا گیا۔ اس عرصے میں روز

امید دلائی جاتی کہ اب واپسی کے احکام جاری ہی ہونے والے ہیں۔ اس لیے بیوی بچوں کو بھی نہ بلا سکتا تھا۔ کراچی میں ان کو کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ میری سزائیں وہ بھی شریک رہے۔ جلا وطنی کی مدت ختم ہوئی تو اپنی پہلی جگہ پر واپس بلا لیا گیا۔

بے مزد بود و منت ہر خدمتے کہ کردم

یارب مدہ کسے را مخدوم بے عنایت

ایک لطیفہ یاد آیا۔ غلام محمد صاحب کی تحریر پڑھنا آسان نہ تھا۔ خوش قسمتی سے وہ میرے نوٹ پر دستخط کر کے واپس کر دیتے۔ ایک مرتبہ تین چار سطریں اپنے دست مبارک سے لکھ دیں۔ میں نے لاکھ پڑھنے کی کوشش کی۔ کامیاب نہ ہوا۔ ساتھیوں کو دکھایا وہ بھی نہ پڑھ سکے۔ مشورہ ہوا کہ خود ان ہی کے پاس لے چلو۔ ناراض ہوں گے لیکن احکام کا پتہ چل جائیگا۔ حاضر خدمت ہوا۔ اپنی تحریر دیکھی۔ پوچھا یہ کب سے تمھارے پاس ہے۔ عرض کیا تین دن سے۔ فرمایا تم کیسے توقع رکھ سکتے ہو کہ تین دن تک میں یاد رکھوں کہ میں نے کیا لکھا تھا۔ اس کو واپس لے جاؤ۔ چنانچہ کاغذات سمیٹ خاموش واپس ہوا۔ غلام محمد صاحب کی گفتگو پہلے بھی مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن جب گورنر جنرل بننے کے بعد آخری مرتبہ ان سے ملا تو ایک حرف سمجھنا مشکل تھا۔ چائے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے قریب بیٹھنا پڑا۔ ان کے سوالات کا جواب دینا فرض تھا۔ لیکن بات ہی جب سمجھ میں نہ آئے تو جواب کیا دیا جائے۔ سُوئے ادب کے خیال سے ایسی کوفت اور تکلیف میں مبتلا رہا کہ آج تک نہیں بھول سکتا۔ یہ معمہ سمجھ میں نہیں آیا کہ باوجود ان مجبوریوں کے وہ گورنر جنرل کس طرح بنے۔ اور کیونکر اس عہدہ پر اتنے عرصے تک فائز رہے۔

مسلمانوں کا وہ آئین طبع مستقل بدلا
چھٹی عربی گیا قرآں زبان بدلی تو دل بدلا

ملّت اسلامیہ کو زندہ اور متحد رکھنے والی زبان عربی ہے۔ لیکن جیسے مسلمانوں کا یہ اصول رہا۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ویسے ہی جس ملک میں یہ مذہب پہنچا وہاں کے لوگ وہیں کی زبان کو اپنی زبان بنائے رہے۔ خواہ وہ فارسی ہو یا ترکی، چینی ہو یا روسی۔ ہندوستان میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی سرکاری زبان فارسی تھی۔ لیکن مختلف علاقوں کے مُسلمان اپنے علاقہ کی زبان ہی کو اپنی زبان سمجھتے۔ پنجاب کے مسلمانوں کی پنجابی، سندھ کے مسلمانوں کی سندھی۔ اور بنگال کے مسلمانوں کی زبان بنگالی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلوں کی دیوانی سنبھالی تو اس کے افسر بھی فارسی میں عدالت کا کام کرتے رہے۔ پھر ان کو خیال آیا کہ اگر فارسی عدالتی زبان نہ رہے تو ملک میں مسلمانوں کا اثر کم ہو سکتا ہے۔ اس لیے سرکاری زبان انگریزی قرار پائی۔ ساتھ ہی انھوں نے اس ملی جلی زبان کو جسے اُردو کہتے تھے آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ اس زبان میں شعر کہنا تو فطری طور پر عرصے سے شروع ہو چکا تھا۔ سرکار انگریزی کے اشارے پر نثر میں تصنیفات شروع ہُوئیں۔ رفتہ رفتہ اسے عدالت کی زبان بنا دیا گیا۔ مسلمان غلامی قبول کر چکے تھے فارسی

ان کی ملی زبان بھی نہ تھی۔ انھیں خیال بھی نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ تحریک نان کوآپریشن شروع ہونے تک کی صورت حال اکبر نے یوں بیان کی تھی۔

ہندو و مسلم ایک ہیں دونوں
یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن، ہم زبان و ہم قسمت
کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں

تحریک کے دوران میں انگریزوں نے محسوس کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کو ہر قیمت پر پارہ پارہ کیا جانا چاہیے۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو اور ہندی کی جدا جدا سرپرستی کر کے دونوں زبانوں میں رقابت کا جذبہ بھڑکایا جا چکا تھا۔ پھر ۱۹۰۰ء میں دیوناگری رسم الخط کے عدالتوں میں رائج ہونے سے دونوں قوموں کے تعلقات کو سخت صدمہ پہنچ چکا تھا۔ اب اس شراب کو دو آتشہ بنانا زیادہ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ یہ سوال اٹھوایا گیا کہ سوراج ملنے پر قومی زبان کیا ہوگی۔ گاندھی جی پہلے تو اس مسئلے پر چپ رہے۔ پھر کہا کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ جو ہند کے ہر حصے میں سمجھی جاتی ہے۔ اس پر سوال یہ ہوا کہ اس کا رسم الخط کیا ہوگا۔ یہ مشکل سوال تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کے رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں کو اس جواب سے تسکین نہ ہوئی۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ دھوکا ہے اور اس بہانے سے گاندھی جی ہم پر ہندی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ الٰہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی قائم کی گئی۔ جس کا مقصد ایسی زبان میں کتابیں شائع کرانا تھا جس میں نہ مشکل فارسی اور عربی کے لفظ ہوں نہ غیر مانوس سنسکرت کے محاورے استعمال کیے گیے ہوں بلکہ ایسی زبان ہو جو ہر

ہندوستانی سمجھ سکے۔ اکیڈمی نے کچھ کتابیں اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع کیں لیکن زبان کا تنازع ختم کرنے میں ناکام رہی۔ حضرت اکبر نے کہا تھا۔

وہ لطف اب ہندو و مسلم میں کہاں
اغیار ان پر گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا زباں کی کبھی بحث
ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤ زباں

حضرت اکبر کی دُور بین نگاہیں جن نکتوں کو دیکھتی تھیں ان پر سیاسی شورش کرنے والوں کی نظر کہاں پہنچ سکتی تھی۔ سنت ابراہیمی تو دُنبہ کی قربانی ہے۔ مسلمانوں کو گائے کی قربانی کی اجازت ضرور ہے۔ لیکن نہ فرض ہے نہ واجب۔ سہولت کے لیے اونٹ، گائے، بکری، دُنبہ سب کی اجازت دی گئی ہے۔ جہاں حالات اجازت نہ دیتے ہوں کسی ایک جانور کی قربانی پر اصرار فرض نہیں۔ اس اصرار سے مسلمانوں نے جس قدر جانی اور مالی نقصان اٹھایا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اسی طرح اردو کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے پر اصرار کر کے اپنی قدیمی تہذیب اور اُردو زبان کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ گو یہ مشترکہ زبان تھی اور مسلمانوں کے زوال کی یادگار تھی۔ لیکن مسلمان اسے اپنی میراث سمجھتے تھے۔ اس لیے تقسیم ہند کے بعد بھارت میں اُردو دشمنی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ لیکن پاکستان میں اردو کے تسلیم شدہ اور واحد قومی زبان نہ ہونے کا کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ یہ ایک بنیادی مسئلہ تھا جس کے تسلیم نہ ہونے پر کانگرس سے اختلافات بڑھے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد ہی بنگالی کو قومی زبان بنانے کے لیے ہنگامے شروع ہو گئے۔ قائد اعظم خود مشرقی پاکستان تشریف

لے گئے اور اعلان کیا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہو گی۔ ان کی حیات میں تو سب خاموش رہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد ہی یہ تحریک پھر شروع ہو گئی۔ میں جوٹ بورڈ میں تھا کہ تحریک عروج پر پہنچی۔ چٹاگانگ کے دورہ پر گیا ہوا تھا کہ اس مسئلے پر ہنگامے شروع ہو گئے۔ اردو بولنے والے اپنے گھروں میں سہمے بیٹھے رہے۔ چٹاگانگ میں میں اپنے قدیمی دوست اسلم صاحب کلکٹر کسٹم کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ نرائن گنج سے ٹیلیفون آیا کہ دفتر کے احاطہ میں چار پانچ ہزار آدمی جمع ہیں۔ میں نے فوراً پہنچنا اپنا فرض سمجھا۔ اسلم صاحب بہت روکتے رہے۔ لیکن میں رات کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ گاڑی صبح چھ بجے ڈھاکہ پہنچنی تھی۔ رُکتی رُکتی پانچ بجے شام کو پہنچی۔ ہر جگہ ہنگامہ نظر آیا راستے میں ایک گلاس پانی بھی نہ ملا۔ اسٹیشن پر دفتر کی کار موجود تھی۔ چودہ میل کا مزید سفر طے کر کے دفتر پہنچا۔ وہیں رہائش تھی۔ سارا احاطہ نیم مجنوں مجمع سے بھرا تھا۔ مشکل سے گھر میں داخل ہوا۔ ٹیلیفون کٹا ہوا، پانی بند بجلی غائب۔ آئندہ دو دن جس عالم میں گزرے۔ عمر بھر یاد رہیں گے۔ فسادات کا عادی ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا شہر شہر گھوما۔ لیکن جو کیفیت اب گزری تجربے سے باہر تھی۔ یونیورسٹی میں گولی چلی تھی دو طالب علم مارے جا چکے تھے۔ سرکار پر خوف و ہراس طاری تھا۔ آخر کار حکام ان ہنگاموں کی تاب نہ لا سکے اور بنگلہ کو قومی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ اس طرح پاکستانی مسلمانوں نے برج بھاشا رسم الخط کو قومی رسم الخط بنا دیا۔ بولنے میں اردو اور ہندی میں زیادہ فرق نہیں۔ یہ ہندی رسم الخط تھا جسے تسلیم کرنے پر انکار نے وہ شدت اختیار کی تھی کہ برصغیر تقسیم ہوا۔ ہندی بولی جاتی تو ہم کم سے کم سمجھ تو لیتے۔ اب ہمارے سر وہ قومی زبان تھوپی

گئی جس کا ایک لفظ بھی کانوں کو مانوس نہیں ۔ یا تو اردو مشرقی پاکستان کے معزز گھرانوں کی مسلمہ زبان تھی یا اب اس سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ اردو میں اگر پانی مانگو تو اینٹ اور پتھر سے جواب ملتا ۔ اب بھی اردو بولنے والے چن چن کر قتل کیے جاتے ہیں ۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں اب تک اردو بولنے والوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا ۔ وہاں تو اب بھی بہت سے ہندو اردو پر عاشق ہیں ۔ انجمن ترقی اردو کام کر رہی ہے، اردو اکیڈمی قائم کی گئی ہے ۔ اردو میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے ۔ مشاعرے ہوتے ہیں جن میں ہندو شعراء مسلمانوں کے شانہ بشانہ شریک رہتے ہیں ۔ متعدد اردو اخبار نکل رہے ہیں ۔ ہندوستانیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے ملک میں پاکستان سے زیادہ اردو کتابیں شائع ہوتی ہیں ۔

بنگالی کے بعد سندھی کا مطالبہ ہے کہ اسے بھی قومی زبان کا درجہ دیا جائے اور اس مطالبہ پر روز بلوے کی خبریں ملتی ہیں ۔ یہاں بھی اردو بولنے کے جرم میں کتنے مر چکے ہیں پٹھانوں کا لسانی بنیاد پر پختونستان بنانے کا مطالبہ تو پرانا ہو چکا ہے ۔ ایک پنجاب تھا جو اب تک اردو کو گلے سے لگائے رہا ۔ لیکن اب یہاں بھی پنجابی تحریک زور پکڑ رہی ہے ۔ وہ دن دور نہیں کہ جب پنجابی کو بھی قومی زبان بنانے کا مطالبہ شروع ہو جاتے ۔ اور اردو بولنے والوں کے ساتھ یہاں بھی وہی سلوک ہو جو مشرقی پاکستان اور سندھ میں ہو رہا ہے ۔

اردو تحریک پاکستان کا اہم ترین ستون تھی ۔ جس دن بنگلہ قومی زبان بنی اور دوسری زبانوں کے مطالبے شروع ہوئے اسی دن نظریۂ پاکستان ختم ہوا ۔

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

اُردو کے مرثیہ پر افسردگی کم کرنے کو زبان ہی کے مسئلے پر لسان العصر کے چند اشعار سن لیجیے۔

معنی جنگِ اُردو و ہندی
میں یہ سمجھا بہ عالمِ رندی
یعنی ہے اس میں لطفِ وصلِ بتاں
خوب مل کر لڑی زباں سے زباں

میں نے کہا بہت سی زبانیں ہُوں جانتا
مدت تک امتحاں دیئے امتحان پر
انگلش، فرنچ، جرمن ولیٹن پہ ہے عبور
ظاہر مرا کمال ہے سارے جہان پر
اک شوخ طبع مس نے دکھائی زباں مجھے
بجلی تھی ابر میں کہ قمر آسمان پر
بولی رہوگے زیست کی لذت سے بے خبر
قدرت نہ پائی تم نے اگر اس زبان پر

نومیدی ما گردش ایام نہ دارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

پاکستان کو وجود میں آئے ہوتے سال بھر ہی گزرا تھا۔ معاشی زندگی ابھی درہم برہم تھی۔ مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ جو آچکے تھے کھلے میدانوں میں بھوک اور بیماری سے مر رہے تھے۔ آئین کے بنیادی اصول طے ہونے باقی تھے۔ کشمیر کا جھگڑا ہو رہا تھا۔ حیدرآباد پر ہندوستان کی لشکر کشی کی افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ ہر طرف ایسی مشکلات کا سامنا تھا جن کا کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ اور ان کے حل کی امیدیں صرف ایک شخص سے وابستہ تھیں وہ قائد اعظم محمد علی جناح تھے۔ دس ستمبر ۱۹۴۸ء کی رات کو ہم سید ہاشم رضا کے گھر میں بیٹھے تھے۔ اکبارگی ٹیلیفون آیا۔ ٹیلیفون پر باتیں کر کے ہاشم رضا صاحب واپس آئے تو ان کا رنگ زرد تھا۔ وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ قائد اعظم کا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا اعلان کل ہو گا۔ مجھے فوراً انتظامات کے لیے طلب کیا گیا ہے۔ دنیا تاریک ہو گئی۔ ہاشم رضا صاحب وزیر اعظم کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوتے۔ ہم سناٹے میں گھر چلے۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ نماز فجر کے وقت باہر نکلا۔ ہر طرف لوگ پریشان گروہوں میں کھڑے تھے۔ انتقال کی خبر راز میں رکھی گئی تھی۔ لیکن سارے شہر میں پھیل چکی تھی۔ ہر شخص مضطرب تھا اور اس کی تحقیق کے لیے بے قرار تھا۔ دن چڑھے جنازہ اٹھا۔ اس میں سارا شہر شریک تھا۔ اور میں بھی اس انبوہ کثیر میں دھکے کھاتا ساتھ ساتھ روتا جاتا۔ جنازے کو توپ کی گاڑی پر لے جایا گیا۔ جسے نیوی

کے افسر کھینچ رہے تھے۔ اس پر اکثر لوگوں کو اعتراض تھا۔ توپ کی گاڑی پر جنازہ لے جانا عیسائی ممالک کی رسم ہے۔ مسلمان اپنے ہادیوں کو ہمیشہ اپنے کندھوں پر آخری آرام گاہ تک پہنچاتے رہے۔ اس مغربی رسم نے ان ہزاروں کو اپنے قائد کے جنازے کو کاندھا دینے سے محروم رکھا جو اس سعادت کے لیے بے چین تھے۔

اسکندر مرزا صاحب ڈیفنس سیکرٹری تھے۔ اس زمانے میں میرے ان کے بڑے مراسم تھے۔ جب وہ وزیر بنے اور پھر پریذیڈنٹ ہوئے تو یہ مراسم ختم ہو گئے۔

راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

قائداعظم کے انتقال کے دُوسرے دن ان کا ٹیلیفون آیا کہ میرے دفتر آؤ کچھ مشورے کرنے ہیں۔ میں پہنچا تو شعیب صاحب اور ابوطالب نقوی صاحب وہاں موجود تھے اور ایک مسودہ زیرِ غور تھا۔ یہ مسودہ استعفےٰ کا تھا۔ اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ موجودہ سرکار نے بابائے قوم کے علاج کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا۔ قوم کو ان کی نازک حالت سے بے خبر رکھا گیا۔ کوئی ان کی صحت کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعا بھی نہ کر سکا۔ لاپرواہی اور بے اعتنائی اس حد تک پہنچی کہ ان کے لیے لوٹی پھوٹی ایمبولنس بھیجی گئی جو بندر روڈ پر آ کر رک گئی۔ وہیں کسمپرسی میں انھوں نے دم توڑا۔ گورنمنٹ کی شقی القلبی کے خلاف ہم احتجاجاً مستعفی ہوتے ہیں۔ مجھے تو حکم ہے کہ جو کچھ کہو بجا کیجیے۔ دستخط کر دیے۔ لیکن نقوی صاحب نے کہا کہ ایسا استعفیٰ چھپا نہیں رہ سکتا۔ اس وقت قوم انتہائی غم اور مایوسی کے جذبے سے مغلوب ہے۔ اس

خبر سے یہ جذبہ اضطراب اور غصّے میں تبدیل ہو جاتے گا۔ جس کے نتائج نہایت سنگین ہو سکتے ہیں۔ اس پر کاغذات پھاڑ دیئے گئے۔

قائدِ اعظم کے ناوقت انتقال نے قوم کی قسمت بدل دی۔ اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبہ پر آج تک موجود ہیں۔

خوُن قطرہ قطرہ می چکد از چشمِ تر ہنوز
نگسستہ ایم بخیۂ زخمِ جگر ہنوز

دل بردن ازایں شیوہ عیاں است عیاں نیست
دانی کہ مرا بر تو گمان است گمان نیست

قائداعظم کے فردوس نشین ہونے کے بعد ہی لیاقت علی خاں کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ ایک سازش پکڑی بھی گئی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ان کو شہید کر دیا گیا بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قتل ایک بڑی سازش کا نتیجہ تھا۔ لیکن نہ کسی کے پاس ثبوت ہے نہ اس کی تفصیل۔

دُنیا نے محض یہ دیکھا کہ غلام محمد صاحب کو وزارت سے نکالا جا رہا تھا۔ انھوں نے استعفیٰ دینے سے پہلے چند دن کی مہلت مانگی تھی۔ اس مدّت کے اختتام سے پہلے ہی یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ وہ گورنر جنرل بن گئے۔ پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس وزیراعظم کی حفاظت کے ذمہ دار تھے۔ انھوں نے جس طرح اپنے فرض کو انجام دیا اس کے عوض میں وہ ترقی کر کے بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ بنا دیے گئے۔ جس افسر نے قاتل کو گولی مار کر موقع پر ہی ہلاک کر دیا تھا اور اس طرح تحقیقات ناممکن بنا دی تھی اس کو ترقی پر ترقی ملتی رہی۔

اعتزازالدین صاحب مرحوم انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ ان کے سپرد اس معاملے کی تحقیق ہُوئی۔ ان سے پوچھا تو کچھ نہ بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ میاں موت سر پر کھیل رہی ہے۔ آخر دورانِ سفر ہوائی جہاز کے حادثے کا شکار ہُوئے ان کے ساتھ ہی وہ کاغذات بھی تباہ ہُوئے جو اس مسئلے پر روشنی ڈال سکتے تھے پھر بیرونی ماہرین

طلب کیے گئے لیکن بات وہیں کی وہیں رہی۔

لیاقت علی خاں صاحب کے ساتھ پاکستان میں جمہوری طرز کی حکومت کی امیدیں دفن ہوئیں۔ غلام محمد صاحب کی جگہ چودھری محمد علی صاحب وزیر خزانہ ہوتے۔ چودھری صاحب کے مزاج اور طبیعت اور غلام محمد صاحب کے مزاج اور طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا میں نے۔ تنگ دل ہو کر ایک دوست سے کہا تھا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ پاکستان میں تعصّب کا یہ عالم ہو گا تو ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں تباہ ہونا زیادہ پسند کرتا۔ یہ بات ان کے کان تک پہنچ گئی۔ ابھی دل کے دورے سے اُٹھے تھے اور بلیر میں آرام کر رہے تھے میں انکے خاص نیازمندوں میں نہ تھا پھر بھی خود بلوایا اور گھنٹوں سمجھایا۔ یقین دلایا کہ تم جلد ہی جوائنٹ سیکرٹری بنائے جاؤ گے۔ اس وقت ریلوے کے حساب کے محکمے میں بے اطمینانی کی فضا ہے۔ کچھ دنوں کے لیے لاہور چلے جاؤ بہت جلد واپس بلا لیے جاؤ گے۔ میں نے کہا مجھے نہ جوائنٹ سیکرٹری بننے کا شوق ہے۔ نہ سیکرٹریٹ کی فضا سے دلچسپی۔ میرا تو تقاضا یہی تھا کہ میں یہاں کے معیار پر پورا نہیں اترتا تو اپنے محکمے کو واپس کیا جاؤں۔ جواب ہمیشہ یہی ملا کہ یہاں کا کام بغیر تمھارے نہیں چل سکتا۔ اب میں ریلوے پر بھیجا جا رہا ہوں تو بہت خوش ہوں۔ اور واپس آنے کی مجھے کوئی خواہش نہیں۔ لیکن چودھری صاحب اصرار کرتے رہے کہ تمھیں ضرور واپس آنا ہے۔ بہر صورت لاہور چیف اکاؤنٹس آفیسر بنا کر بھیجا گیا۔ دل نے کہا۔

دریں بازار بشکن قدر خود را
کہ گیتی جنس ارزاں می پسندد

بہ دعوت گاہ محشر بر سر منشور رسوائی
میان ما و مجنوں گفتگو بسیار خواہد شد

لاہور میں میرا بہت پر جوش خیر مقدم ہوا۔ پانچ چھ ہزار افراد اسٹیشن پر موجود تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ سمجھا کہ ریلوے سے میری پرانی وابستگی لوگوں کو ابھی تک یاد ہے اور وہ میرے ساتھ اپنے لگاؤ کا اظہار کر رہے ہیں۔

گوشۂ چشمے اگر ساقی بہ ما دارد بجاست
عمرہا در گوشۂ مے خانہ خدمت کردہ ایم

غلط فہمی تھی۔ اس میں حُبّ علی کو دخل نہ تھا۔ صرف بغض معاویہ کا اظہار تھا جن صاحب کی جگہ مجھے بھیجا گیا تھا انھوں نے کچھ ایسی سختیاں کر رکھی تھیں کہ لوگ ان سے بیزار تھے اور ان کو آزردہ کرنے کے لیے اس مظاہرہ کا انتظام کیا گیا تھا۔

کچھ دنوں بعد سردار بہادر خاں صاحب نے جو وزیر مواصلات تھے اعلان کیا کہ وہ ریلوے سے رشوت ختم کرنے کی مہم شروع کر رہے ہیں۔ لاہور آئے، سب افسروں کو جمع کیا۔ تقریر کی کہ رشوت ستانی ختم کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اور وہ ہر اس شخص کو نوکری سے نکال رہے ہیں جس کے متعلق رشوت لینے کا شبہ ہو۔ کس کی مجال تھی کہ دم مارے ایک میں ہی تھا جس نے عرض کیا کہ نوکری سے نکالنے کا اختیار آپ کو پُورا پورا ہے لیکن اس طرح رشوت ستانی بڑھے گی۔ کم نہ ہو گی۔ جس کو آپ مقرر کرینگے وہ پہلے سے زیادہ رشوت لے گا۔ آپ وہ حالات پیدا کریں جس میں لوگوں کو ایمانداری سے

فرائض انجام دینے کا موقع اور ترغیب ہو۔ پہلے گورنمنٹ کی سازشیں، بے ایمانیاں اور ناانصافیاں بند کیجئے۔ پھر لوگوں کی اُجرت حالات کے مطابق کیجیے۔ قیمتیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ہر شخص بھوکا ہے۔ افسر اس معیار زندگی کے مطابق زندگی نہیں بسر کرسکتے جس کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔ اور جس کے قائم رکھنے پر معاشرہ کو اصرار ہے۔ مزدور سچ مچ بھوکا مرتا ہے۔ یا تو گورنمنٹ صحیح معنوں میں خود فقرو فاقہ کی مثال پیش کرے جس طرح خلفائے راشدین اور ان کے مشیر کرتے تھے۔ یا دوسروں سے اس کی توقع نہ کرے بہرصورت آپ جو طریقہ اختیار کر رہے ہیں اس سے رشوت کم نہ ہوگی بڑھتی ہی جائیگی۔ وزیر صاحب میری اس جرأت پر بہت ناراض ہوئے۔ لیکن تجربے نے ثابت کر دیا کہ میری رائے غلط نہ تھی۔ تین مرتبہ شبہ کی بناء پر افسروں کو نکالا جا چکا ہے۔ تینوں مرتبہ رشوت تیزی سے بڑھی یہاں تک کہ اب آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ بزرگ کہہ گئے ہیں۔

اگر ز باغ رعیت ملک خوردہ سیبے
برآورند غلاماں او درخت از بیخ!
بہ نیم بیضہ چو سلطان ستم روا دارد
زنند لشکریانش ہزار مرغ بسیخ

وزیر موصوف کو ایک اور معاملے میں ناراض کیا۔ ریلوے ڈائی ننگ کار کا ٹھیکہ دینا تھا۔ ٹنڈر طلب کیے گئے۔ ایک صاحب کی سفارش منسٹر صاحب نے خود ٹیلیفون سے کی۔ اتفاق سے یہی سب سے موزوں تھے۔ لیکن میں نے ان کو ٹھیکہ نہ ملنے دیا اور لکھ دیا کہ اگر قاعدے کے مطابق کوئی سفارش کرائے یا کمیٹی کی رائے پر اثر ڈالنے کی کوشش کرے تو اس کو ٹھیکہ نہیں مل سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شخص

سب سے زیادہ موزوں ہے۔ لیکن اس نے وزیر مواصلات سے سفارش کرائی ہے اس لیے اس کے نام پر غور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کمیٹی کے دوسرے ممبروں نے مجھ سے اتفاق کیا۔ وزیر صاحب بہت ناراض ہوئے اور مجھ سے توجیہہ طلب کی گئی۔ میں نے اپنا نوٹ بھجوا دیا۔ مجبوراً خاموش ہو گئے۔ ابھی انگریزی عہد کی یاد تازہ تھی۔ قاعدوں اور قانون کا احترام باقی تھا۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ رشوت یا سفارش کے بغیر کام کرنے والا احمق سمجھا جائے اور قانون کی پابندی قابلِ سزا سمجھی جائے۔ چینی فلسفی کنفوشس کی تعلیم یاد آئی:۔

"بزرگ ملک کی بہتری چاہتے تو وہ اپنی سلطنت کو اعلیٰ سطح پر لاتے۔ سلطنت کو اعلیٰ سطح پر لانے کے لیے وہ پہلے اپنے خاندان کے حالات درست کرتے۔ خاندان کے حالات درست کرنے کے لیے وہ پہلے خود اپنی اصلاح کرتے۔ اپنی اصلاح کرنے کے لیے وہ پہلے اپنے دلوں کو پاک کرتے دل پاک کرنے کے لیے وہ پہلے اپنے خیالات میں ایمان اور نیکی پیدا کرتے۔ خیالات میں ایمان اور نیکی پیدا کرنے کے لیے وہ پہلے اپنے علم میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرتے۔ علم میں اضافہ موجودات کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔

موجودات کے مطالعہ سے علم مکمل ہو جاتا۔ علم کے مکمل ہونے سے خیالات میں نیکی پیدا ہوتی۔ خیالات میں نیکی آنے سے ان کے دل پاک ہو جاتے۔ دلوں کے پاک ہونے سے ان کی اصلاح ہو جاتی اپنی اصلاح سے ان کے خاندان کے حالات درست ہو جاتے۔ خاندان

کے حالات درست ہونے سے ان کی حکومتیں صحیح طریقے پر چلنے لگیتیں۔
حکومت صحیح طریقہ پر چلنے سے سارے ملک میں امن اور خوش حالی کا
دور دورہ ہوتا۔"

چودھری محمد علی صاحب بات کے پکّے تھے۔ دو مرتبہ مجھے جوائنٹ سیکرٹری بنا کر بلانا چاہا۔ میں نے انکار کیا۔ لاہور میں ماحول خوش گوار تھا۔ مشرقی پاکستان میں صحت برباد ہو چکی تھی۔ پیچش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ لاہور کی آب و ہوا میں رفتہ رفتہ صحت درست ہو رہی تھی۔ اس لیے دونوں مرتبہ ترقی تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ تیسری مرتبہ کہا گیا کہ اب بھی نہیں آتے تو تم سے نیچے کے افسر کو مجبوراً براہ راست تم سے اُوپر رکھنا ہو گا۔ سرکاری ملازمت میں یہ صورتِ حال کسی کو منظور نہیں ہوتی۔ مجبوراً کراچی گیا۔

ترشی مکن چو سرکہ چوں شہد باش شیریں
قند و نبات و شکر دکان ماست امشب
لعلی کہ در بدخشاں ہرگز نہ شد درخشاں
بے رنج و غصہ آساں درکان ماست امشب

آزادی کے وقت سے جہاں ہر شعبہ میں ہندوستان سے جھگڑے چل رہے تھے وہاں ریلوے کے بھی جھگڑے تھے ہر سال میٹنگ ہوتی۔ طے کچھ نہ ہوتا۔ ۱۹۵۴ء میں میں ریلوے کا فنانشل ایڈوائزر بنا تو چھٹی یا ساتویں میٹنگ کی تیاری تھی معلوم ہوا کہ آخری جلسہ ایسی تو تو میں میں پر ختم ہوا کہ فریقین میں بات چیت ختم ہوگئی تھی۔ اب پھر ایسی فضا میں ملاقات ہو رہی تھی کہ کسی کامیابی کی امید نہ تھی۔ دو بڑے جھگڑے درپیش تھے۔ تقسیم ملک کے وقت مجموعی طور پر ریل کی گاڑیاں تقسیم ہوگئیں تھیں اور جانبین کے پاس صحیح تعداد میں موجود تھیں۔ لیکن ہر گاڑی کی عمر اور حالت مختلف تھی آٹھ برس سے متواتر یہ بحث جاری تھی کہ کون سی گاڑی کدھر جائے۔ اس جھگڑے میں جانبین نے یہ رویہ بھی اختیار کر رکھا تھا کہ جس گاڑی کا دوسری طرف سے مطالبہ ہو اس کی مرمت ٹھیک طور پر نہ کی جائے۔ اس طرح ہزاروں گاڑیاں دونوں طرف برباد ہو رہی تھیں۔ اس میں کسی کا فائدہ نہ تھا۔ لیکن لڑائی میں آدمی کیا کچھ نقصان نہیں کرتا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ جو گاڑی جہاں ہے رہنے دی جائے۔ اس کو سب نے خوشی سے مان لیا۔

ہندوستان کا مال پاکستان ہو کر آسام جاتا۔ پاکستان کو کرایہ کے سلسلے میں ایک

بڑی رقم وصول کرنی تھی۔ اندازاً نو کروڑ روپے۔ بین الاقوامی معاہدہ کے تحت پاکستان کو چھ مہینے کے اندر اپنے مطالبات پیش کر دینے تھے۔ لیکن یہاں حساب رکھنے کا کوئی انتظام ہی نہ تھا۔ تین یا چار برس کے بعد ہوش آیا تو ہندوستان نے کہا کہ معاہدہ کے تحت مطالبہ کی مدت ختم ہو چکی۔ اب اس کو ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کئی سال سے یہ لڑائی چل رہی تھی روانگی سے قبل میں نے وزیر خزانہ کو کاغذات دکھائے اور بتایا کہ قانوناً ہم اس رقم کی ادائیگی پر اصرار نہیں کر سکتے آپ کوئی دلیل بتا دیجئے جس کی بنا پر یہ جھگڑا جاری رکھا جا سکے۔ انھوں نے ہدایت کی ان حالات میں اس مطالبہ کو واپس لے لو۔ میں نے مطالبہ تو واپس نہ لیا۔ لیکن جلسے میں ہندوستانی ڈیلیگیشن کے قائد سے کہا کہ آپ خود اس کا فیصلہ کریں۔ یہ بہت سٹ پٹائے اور اصرار کرتے رہے کہ تم اپنے دلائل پیش کرو۔ میں نے جواب دیا کہ دلیلیں سالوں سے پیش ہو رہی ہیں اور نتیجہ ہمیشہ بدمزگی رہا ہے۔ ہم معاملات کو سلجھانا چاہتے ہیں اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں خواہ اس میں کتنا ہی نقصان ہو لہذا آپ ذاتی طور پر اس کا فیصلہ کر دیجیے۔ ہم پہلے ہی منظور کر لیتے ہیں۔ ماتھر صاحب انڈین ریلوے بورڈ کے چیئرمین اور ہندوستانی ڈیلیگیشن کے سربراہ تھے۔ ان کی نیک نیتی پر مجھے کوئی شک نہ تھا۔ وہ بہت سٹ پٹائے۔ لیکن میرے اصرار پر ذمہ داری قبول کی اور معاملے پر غور کرنے کی مہلت مانگی۔ دوسرے دن میٹنگ ہوئی تو فرمایا کہ قانوناً تو یہ مطالبہ رد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اخلاقاً ہم اسکی ادائیگی پر مجبور ہیں کیونکہ حساب سے یہ رقم ضرور نکلتی ہے۔ اس لیے میں اس کا فیصلہ پاکستان کے حق میں کرتا ہوں۔ ہندوستانی اس فیصلہ سے بہت ناراض ہوئے۔ لیکن ان ہی کے سربراہ

کا فیصلہ تھا۔ مجبوراً تسلیم کیا۔ میں نے واپس آکر وزیر خزانہ کو واقعات سنائے تو انھیں
بہت تعجب ہوا۔ اور انھوں نے مجھے کامیابی پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد ہندوستانی
اور پاکستانی ریلوے میں کوئی اختلاف باقی نہ رہا۔ دلّی متعدد بار کانفرنسوں میں جاتا
رہا۔ دوسرے ملکوں میں بھی گفت وشنید کے لیے گیا۔ کبھی نہ دیکھا کہ کٹھ حجتی
اور ہٹ دھرمی سے کوئی فائدہ ہوا ہو۔ اور کوئی مسئلہ ایسا نہ پایا جو اعتماد اور نیک
نیتی سے منٹوں میں حل نہ ہو سکے۔

تہمت عجز است سدّ راہ صائب ورنہ من
از رہ دُشمن بہ مژگان خاک برمی داشتم

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم
مگر نازم بہ آں ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم

۱۹۵۶ء میں عالمی بنک نے ایک نیا ادارہ قائم کیا جس کا نام اکانومک ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ ہے۔ اس سے تمام دنیا کو بڑی توقعات تھیں اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر ملک کے اعلیٰ ترین افسروں کو ترقیاتی معاشیات کی اعلیٰ ترین تربیت دی جائے۔ میرا انتخاب پہلے کورس کے لیے ہوا۔ میں بہت خوش تھا کہ اب ان باتوں کو سیکھنے کا موقع ملے گا جو اب تک میرے علم سے بالاتر تھیں۔ ۱۹۴۸ء سے ہر سال دو تین مرتبہ خریداری یا عالمی بنک سے گفت وشنید کے سلسلے میں یورپ اور امریکہ جانا رہا۔ لیکن یہ سفر ہوائی جہاز سے ہوتے۔ اس مرتبہ بینک سے کرایہ ملنا تھا۔ شوق ہوا کہ پانی کے جہاز سے سفر کروں۔ انگلستان سے کوئین الزبتھ میں سفر کا انتظام کیا۔ سفر ۲۸۔ دسمبر کو شروع ہوا۔ اس جہاز کا آرام اور اس کی شان وشوکت مشہور عالم تھی۔ اس پر ڈیوک اور ڈچس آف ونڈسر بھی سفر کر رہے تھے۔ محبت پر سلطنت قربان کرنے کی داستان یاد آئی۔ ان کے ساتھیوں کے لیے جہاز کا علیحدہ حصّہ مخصوص تھا۔ اور دوسرے مسافران کو دیکھتے بھی نہ تھے۔ لیکن راستے میں نئے سال کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر شاندار ناچ کا انتظام تھا۔ میری ابھی کسی سے واقفیت بھی نہ تھی۔ ناچ کے ہال میں ایک کونے میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اتنے میں ڈیوک اور ڈچس آئے۔ کچھ دیر ڈچس لوگوں سے باتیں کرتی رہیں اور رقص بھی کیا۔ پھر

پھر ان کی شاہانہ نگاہ مجھ پر پڑی جو ایک کونے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ فوراً آئیں۔ میں
کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگیں کہ آج نئے سال کی شام ہے۔ تم اس قدر خاموش کیوں ہو
رقص میں شرکت کیوں نہیں کرتے۔ عرض کی کہ اوّل تو میری کسی سے واقفیت
نہیں پھر رقص کے فن میں میری مہارت مشکوک ہے۔ اگر جوانی میں کچھ سیکھنے کی
کوشش بھی کی تھی تو اب بھول چکا ہوں۔ فرمایا کہ نئے سال کی شام کو اسطرح
بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ میں خود تمھارے ساتھ رقص کروں گی۔ پہلے
مجھے ڈیوک کی خدمت میں پیش کیا۔ پھر رقص کے ہال میں لے گئیں۔ مجھ پر جو گزری
میں ہی جانتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے احساس تھا کہ میں صحیح طریقے سے رقص نہیں
کر سکتا۔ لیکن حکمِ شاہی سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ انھوں نے دُوسری خواتین
سے بھی تعارف کرایا۔ جن کا تعلق انگلستان کے اعلیٰ ترین خاندانوں سے تھا۔ ان
میں سے اکثر کے ساتھ رقص پر مجبور کیا اس طرح ساری رات بیٹھنے کا موقع نہ
ملا۔ ڈچیس پر ضعیفی کے آثار نمایاں تھے۔ یہ تصوّر بھی مشکل تھا کہ یہ اس حُسن کی مالک
رہ چکی ہیں۔ جس نے ایک سلطنت میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ لیکن جس وقت
وہ ہال میں داخل ہُوئیں۔ محفل میں جان آگئی۔ شاید ہی حاضرین میں کوئی موجود
ہو جو ان کی توجہ کا ممنون نہ ہوا ہو۔ ڈیوک پر وحشت اور اضطراب کی کیفیت
نمایاں تھی۔ چہرہ جھریوں سے بھرا تھا۔ رنگ زرد مٹی کا سا تھا۔ ہال میں تشریف
آوری ان کے لیے ایک ناخوشگوار فرض معلوم ہوتی تھی۔ بہت مشکل سے
ایک یا دو رقص میں حصّہ لیا ہو گا۔ شراب کے جام پے در پے نوش
فرما رہے تھے۔ اور زبانِ حال سے کہتے۔

شاہم ولے بہ ملک بلا با سپاہ غم
ملکم بہ بین و خیل سپاہم نگاہ کُن

بہر صُورت ان سے شرف ملاقات میری زندگی کی اہم ترین یادگار ہے۔

اے کہ می گوئی برو تحصیل درس عشق کن
می روم اما پئے تحصیل حاصل می روم

عالمی بینک کے کورس سے بڑی توقعات تھیں۔ شروع ہوا تو معاشیات کی وہ مبادیات سکھائی گئیں جو ہمارے یہاں انٹرمیجیٹ کلاس میں پڑھائی جاتی ہیں دل میں آیا۔

دریں تعلیم شد عمرو ہنوز ابجد ہمی خوانم

کچھ دن چپ رہا کہ دیکھیے اب کیا ظہور میں آتا ہے۔ پھر عرض کی ہماری سرکار نے زرمبادلہ کی ایک بڑی رقم خرچ کر کے ہم کو یہاں بھیجا ہے تاکہ وہ چیزیں سیکھیں جو ہمارے ملک میں میسّر نہیں ہیں۔ آپ ہمارا وقت کن لغویات میں ضائع کر رہے ہیں۔ جواب ملا کہ تم نے اور دو تین دوسروں نے معاشیات کی تعلیم حاصل کی ہے۔ تمھیں یہ باتیں ابتدائی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن باقی ملکوں سے جو لوگ آتے ہیں انھیں ان اصولوں کا علم نہیں۔ یہ سب ترقیاتی پروگرام پر کام کر رہے ہیں۔ انھیں یہ باتیں سکھانی ضروری ہیں۔ اب غور کرنا شروع کیا کہ آخر ہمیں یہاں بلانے کا مقصد کیا تھا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا بینک چند اصولوں کا حامی ہے اور ان اصولوں کو اس طرح ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ ہمارے طرز خیال کا جزو بن جائیں۔ پہلا اصول تو یہ ہے کہ جو کام کرو خواہ کتنا ہی سیدھا اور آسان ہو غیر ملکی ماہرین کی مدد سے کرو۔ دوسرا یہ کہ ترقی کا طریقہ غیر ملکی قرضے سود پر لے کر کارخانے بنانا ہے۔ لیکن کارخانے بنیادی صنعتوں کے نہیں

ہونے چاہئیں روزمرہ زندگی کی ضروریات پُوری ہونا کافی ہے۔ اپنے ملک کے خام مال کو اگر قابلِ فروخت بنا سکو تو زیادہ بہتر ہے۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ سرکار کو کسی صنعت میں دخل نہ دینا چاہیے۔ صنعت کو صنعت کاروں پر چھوڑنا چاہیے۔ معاشی ترقی میں کثرتِ زر ناگزیر ہے۔ اس کا فائدہ اگر چند لوگوں کو ہو تو اچھا ہے۔ عوام کو تو بہر صُورت سختی کی زندگی بسر کرنا لازمی ہے۔ اگر کچھ لوگ آرام سے رہ سکیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ہر شخص فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرے۔ پھر جو کچھ امرا۔ پس انداز کریں گے ترقیاتی کاموں پر صرف کریں گے۔

میں بزرگوں سے سنتا آیا تھا کہ بغیر ہادی کے خدا تک پہنچنا مشکل ہے۔ لیکن دنیاوی مسائل میں تو تعلیم یہ رہی۔

حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

میں غیر ملکی ماہرین کو دیکھ اور پرکھ چکا تھا۔ ان کا عام معیار ہمارے ملک میں دفتر کے سپرنٹنڈنٹ یا کارخانے کے فورمین سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ایک صاحب تو ایسے صاحب کمال تھے کہ انھیں لکھنا بھی نہ آتا تھا۔ انھیں ریلوے سٹورز کا نظام درست کرنے کے لیے بلایا گیا تھا وہ ہاتھ میں ایک کیمرہ لیے پھرتے جہاں کہیں ٹوٹی پھوٹی چیزیں نظر آتیں فوٹو لے لیتے اور سب کو دکھاتے پھرتے۔ ان کا نام رابرٹس تھا۔ آخر میں ہم سب ان کو اسکریپ رابرٹز کے نام سے یاد کرنے لگے۔ کیونکہ یہ اپنی تصویروں کے ذریعہ یہ ثابت کرتے پھرتے کہ ریلوے میں اسکریپ یعنی ٹوٹی پھوٹی چیزیں بہت ہیں۔ انھیں ہم پانچ ہزار تنخواہ مفت کی کار اور مفت مکان دیتے تھے۔ ہم سب نے لاکھ بحث کی کہ غیر ملکی کے لیے ملک کے مسائل سمجھنا دشوار ہے۔ نہ اسے ان مسائل سے

وہ ہمدردی اور دلچسپی ہوتی ہے جو ترقیاتی منصوبوں کے لیے ضروری ہے۔ پھر یہ سودا بھی بہت مہنگا پڑتا ہے۔ ہر ملک کو ایسے منصوبے بنانے چاہئیں جو اس کے ہی ماہرین تکمیل تک پہنچا سکیں۔ اگر اس قسم کے منصوبے کی ضرورت ہو جس کی تکمیل ملکی ماہرین نہیں کر سکتے تو ان کو باہر بھیج کر مزید معلومات حاصل کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ اس طرح منصوبوں کی تکمیل میں دیر بھی ہو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ دوسروں پر انحصار کیا جائے اور اگر تکمیل کے بعد کچھ نقص نکلے تو کوئی شخص اس کا جواب دہ نہ ہو۔ ہماری دلیلیں بے کار تھیں بینک والے اسی کوشش میں مصروف رہے کہ ہم ان کے قول پر ایمان لائیں اور سارے ملک کو غیر ملکی ماہرین کے سپرد کر دیں۔

سود پر قرض لینا ہمارے لیے منع ہے۔ ویسے بھی بزرگوں نے یہی سکھایا تھا کہ قرض میں مبتلا ہونا تباہی مول لینا ہے ترقی اور خوش حالی کا راستہ محنت اور کفایت ہے نہ کہ دوسروں سے قرض لے کر ایسا اثاثہ بنانا جس کے قائم رکھنے کے لیے وسائل بھی ہمارے پاس نہ ہوں ہم نے بہت بحث کی کہ ہمارے پاس سرمائے کی کمی ہے اور انسانوں کی بہتات۔ ہمارے لیے قرض لے کر بڑی فیکٹری لگانا مفید نہ ہوگا۔ ہمیں دیہاتوں میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں قائم کرنی چاہئیں تاکہ بیروزگاری دور ہو اور کم سے کم سرمایہ لگا کر زیادہ سے زیادہ ضروریات زندگی فراہم ہو سکیں۔ بینک کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر سرمایہ نہیں ہے تو قرض لو اور عمدہ سے عمدہ مشینیں خریدو۔ ان ہی مشینوں سے ترقی یافتہ ملک خوش حال ہوتے ہیں۔ ہم کہتے کہ اگر قرض لے کر کارخانے بنانے ہیں تو بنیادی صنعتیں قائم کرنی چاہئیں جو پہلے چھوٹی مشینیں بنانے میں مدد کریں اور بعد میں بڑی مشینیں بنائیں۔ جواب ملتا کہ یہ کام تم سے ابھی نہیں ہو سکتا۔ مشینیں بنانا

دوسروں پر چھوڑ دو۔ تم ان کا استعمال سیکھو۔ ہم جاپان اور روس کی مثالیں دیتے تھے جنھوں نے نہ قرض لیا نہ غیر ملکی ماہرین کی مدد۔ جواب ملتا کہ ان ملکوں کے حالات مختلف تھے۔

عالمی بینک کی تعلیم اور ترغیب نے ہمیں آخر ایسی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے کہ اہلِ نظر کو اب ایک خونریز انقلاب قریب نظر آتا ہے۔ اس میں بنک کے ملازمین کا قصور نہیں ہے۔ بینک وجود میں اِس لیے آیا تھا کہ امریکہ کو فکر تھی کہ دُوسری عالمی جنگ میں اس نے جو صنعتیں قائم کی ہیں ان کے لیے اختتام جنگ پر منڈی نہ ہو گی اس لیے غریب ملکوں کو قرض دے کر خریداری کی ترغیب دیجانی چاہیے۔ اس میں تقریباً چھبیس فی صدی سرمایہ امریکہ کا لگا ہوا ہے۔ یہ وال اسٹریٹ سے قرض لے کر دوسروں کو قرض دیتا ہے۔ اس کا دفتر واشنگٹن میں ہے۔ اس میں بیشتر ملازمین امریکن ہیں اور یہ سی۔ آئی۔ اے کے خفیہ ایجنٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس سے سوائے اس کے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ امریکی سرمایہ داری کو فروغ دے۔ اگر اس کی پالیسیاں کوتاہ بینی اور کوتاہ نظری پر مبنی ہیں اور یہ پس ماندہ ملکوں کو انقلاب کے راستے پر لگا رہا ہے تو یہ کوتاہ بینی اور کوتاہ نظری امریکن سرکار کی ہے۔ جس نے زندگی کے کسی شعبہ میں بھی دُور اندیشی اور انسانی ہمدردی کا ثبوت نہیں دیا۔ ارشاد ربّانی ہے:-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو

کہتے ہیں کہ بے شک ہم تو اصلاح کرنے والوں میں ہیں۔ خبردار
رہو یہ لوگ فساد پھیلانے والے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے۔"

زیں طبیباں مطلب چارہ بیماری دِل
چشم بیمار طبیب دل بیمار من است

مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران کھانے پینے میں بے احتیاطی ناگزیر تھی۔ پیچش ہوگئی جس کے اثرات آج تک باقی ہیں ریاح کی کثرت سے اکثر دل میں درد رہتا۔ امریکہ بار بار جانا ہوتا۔ وزارت عظمیٰ سے سبکدوش ہو کر محمد علی بوگرہ مرحوم دوبارہ امریکہ میں سفیر ہو کر پہنچے۔ محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ شعیب صاحب عالمی بنک میں تھے ان کی دوستی کالج کے زمانے سے چلی آتی تھی۔ دونوں نے اصرار کیا کہ یہاں کے ڈاکٹروں کو دکھاؤ۔ محمد علی صاحب نے کہا کہ میرے ذاتی معالج امراض دل اور معدہ کے لیے مشہور عالم ہیں ان سے مشورہ کرنا چاہیے۔ میں ہچکچاتا رہا۔ لیکن انھوں نے زبردستی اپنے سیکرٹری کے ذریعے سے ڈاکٹر صاحب سے وقت کا بھی تعین کرادیا۔ تین دن ڈاکٹر صاحب طرح طرح کے تجربے کرتے رہے۔ پھر فرمایا کہ کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ لیکن تم سگریٹ بہت پیتے ہو۔ اسے فوراً ترک کردو۔ میں خود بھی اس بے ہودہ عادت سے بہت تنگ تھا۔ ہوٹل واپس آکر سارے سگریٹ تلف کر دیئے۔ دو چار دن تو ہر وقت سگریٹ یاد آتا پھر بھول گیا۔ لیکن وزن کم ہونا شروع ہوا۔ میں نے پرواہ نہ کی۔ اندازاً مہینے بھر کے بعد واپسی ہوئی نیویارک سے شام کو جہاز روانہ ہوتا تھا۔ رات بھر کا سفر ہوتا ۔ صبح اُٹھ کر غسل خانہ گیا وہاں تک پہنچنا تو یاد ہے۔ پھر علم نہیں کیا ہوا۔ اب جو آنکھ کھولی تو اپنی جگہ پر لیٹا

ہوا تھا۔ کوئی ہاتھ سہلا رہا تھا۔ کوئی پیر مل رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ بیہوش ہو گیا تھا جہاز والوں نے لندن اطلاع کی۔ ایمبولنس آئی اور سیدھے ہسپتال لے گئی وہاں نئے سرے سے تجربے شروع ہوئے۔ تیسرے دن ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ چائے منگوائی پھر جیب سے سگریٹ کا ڈبہ نکال کر پیش کیا۔ میں نے کہا امریکن ڈاکٹروں کے مشورے پر اس سے توبہ کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ امریکن ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کرنا ہے تو میں جہاز پر بٹھاتے دیتا ہوں۔ واشنگٹن تک، زندہ سلامت پہنچ جاؤ گے۔ یہاں علاج کرانا ہے تو میرے مشورے پر عمل کرو اور سگریٹ دوبارہ شروع کرو۔ جب تم نے سگریٹ شروع کیے تھے اس وقت مجھ سے مشورہ کیا ہوتا تو میں تاکید کرتا کہ اس کو ہاتھ مت لگاؤ۔ تیس برس میں نکوٹین تمہارے خون کا جزو بن چکی ہے اور غیر شعوری طور پر تمہارا ذہن اس کا غلام بن چکا ہے۔ اب اس کے ترک کی کوشش بے سود ہے۔ میں نے انگریزی ڈاکٹر کے مشورے پر عمل شروع کیا۔ اس دن سے دن بھر سگریٹ پیتا ہوں اور رات بھر کھانستا ہوں۔

دوستت دارم و دانم کہ توئی دشمنِ جانم
از چہ با دشمنِ جانم شدہ ام دوست نہ دانم

دوسری مرتبہ واشنگٹن پہنچا تو محمد علی صاحب اپنا ڈاکٹر بدل چکے تھے۔ دل اور معدے کی تکلیف بدستور قائم تھی۔ اب ان کو اصرار ہوا کہ نئے معالج سے مشورہ کیا جائے۔ نئے سرے سے ٹسٹ ہوئے۔ بار بار ڈاکٹر صاحب حالات پوچھتے رہے۔ اور ہر طرح کے غیر متعلق سوالات کرتے رہے۔ پھر کہا کہ کل شام چار بجے آنا

اس وقت اپنی رائے بتاؤں گا۔ وقتِ مقررہ پر حاضر ہوا تو مطب کے باہر بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب ایک معمّر شخص سے باتیں کرتے باہر تشریف لائے فرما رہے تھے کہ اگر آپ کا جی چاہتا ہے تو ضرور ایسا ہی کیجیے۔ کوئی ہرج نہیں ہے۔ شاید کچھ فائدہ ہو۔ ان حضرت کو رخصت کر کے میری طرف مخاطب ہوتے اور اپنے ساتھ مطب میں لے گئے۔ پوچھا کہ تم نے میری گفتگو سُنی۔ میں نے کہا جو کچھ سُنا سمجھ میں نہ آیا۔ فرمایا کہ یہی گفتگو سننے کو تمھیں اس وقت یہاں بلا کر بٹھایا تھا۔ ان حضرت کی عمر بہتّر برس کی ہے۔ دو لڑکیوں سے ان کے جنسی تعلقات ہیں۔ اور ان سے ہفتہ میں ایک ایک بار ملاقات رہتی ہے۔ اب ایک تیسری لڑکی سے ان کی ملاقات ہوگئی ہے۔ مشورہ کرنے آتے تھے کہ اس طرح تعلقات بڑھانے میں کوئی ہرج تو نہیں؟ میرا جواب تم نے سُن لیا۔ میں نے تمھاری صحت کی اچھی طرح پڑتال کی۔ کوئی خاص بات معلوم نہ کر سکا۔ لیکن تم پردیس میں اکیلے ہو۔ اور اس کا تمھارے اعصاب پر اثر پڑ رہا ہے۔ جب بہتّر برس میں یہ شخص مجرّد نہیں رہ سکتا تو تم تو ابھی جوان ہو۔ تنہائی کی زندگی کب تک بسر کر سکتے ہو۔ تمھاری تکلیف کا علاج آسان ہے۔ کسی اچھی لڑکی کو تلاش کرو اور ہفتہ میں دو تین مرتبہ ساتھ رہ لیا کرو۔ میں نے کہا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے لیے نہ یہ علاج ممکن ہے۔ نہ ضمیر اس کی اجازت دے گا۔ بولے میں اخلاقیات کا پروفیسر نہیں ڈاکٹر ہوں۔ اسی نقطۂ نظر سے علاج تجویز کر دیا۔ اب تمھیں اختیار ہے چاہے اس پر عمل کرو یا نہ کرو۔ میں فیس ادا کر کے یہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردن تو بصد خوں برابر است

از سر کوئے تو ہر کس بہ ملالت بہ رود
نہ رود کارش و آخر بہ خجالت بہ رود

پاکستان کے ابتدائی دور میں جو وزراء ہوتے ان کی وقعت سرکاری افسروں کے دل میں نہ تھی۔ الاّ ماشاء اللہ ہر ایک کا مذاق اڑتا۔ ہر ایک کی نقلیں اتاری جاتیں ہر ایک کے احکامات حماقت کے نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے۔ ادھر اسمبلی کے ممبروں کا عوام کے نمائندہ ہونے کا دعویٰ مشکوک ہو چکا تھا۔ ان میں ہر روز نئی سازشیں اور نئی لڑائیاں ہوتیں۔ ہر شخص اپنے کو بیچنے کو تیار اور صاحب اقتدار کی حمایت کے لیے بے چین تھا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ اس کے منہ مانگے دام ملیں نہیں تو دوسرا راستہ تلاش کیا جاتا۔ ان حالات میں فوج اور سرکاری افسروں کے دل میں یہ خیال ناگزیر تھا کہ وہ حکومت کے زیادہ اہل ہیں۔

قائد اعظم کے انتقال کے بعد ہی فوج نے راولپنڈی کی سازش کر کے اپنے حوصلوں کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ اس سازش کی تفصیل مجھے معلوم نہیں۔ لیاقت علی خاں فوج اور سرکاری ملازمین کی راہ میں سدِّ راہ تھے۔ وہ قتل ہوئے اور سازش کا نیا دور شروع ہوا گو اسمبلی ابھی قائم تھی اور کچھ سیاست دان وزیر بھی تھے۔ لیکن غلام محمد صاحب کے گورنر جنرل بنتے ہی اصل طاقت سرکاری ملازمین کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ان کی مدد سے روز نیا انقلاب برپا ہوتا۔ اور ہر انقلاب کے ساتھ ان کے لیے نئے راستے کھلتے۔ خواجہ ناظم الدین کو انھوں نے قائد ملّت کے خطاب سے نوازا اور جلد ہی ان سے پیچھا چھڑا لیا قانونی اسمبلی

توڑ کر حسبِ مرضی انتخاب کرائے گئے۔ محمد علی بوگرہ نے جس دن خود مختاری سے کارروائی کرنے کی کوشش کی ان سے زبردستی استعفا دلوایا گیا اور پھر ان ہی سے نئی حکومت کی تشکیل کرائی گئی۔ اس طرح بھی تسکین نہ ہوئی تو محمد علی کو بھی نکالا گیا اور ایک سرکاری ملازم جو پہلے ہی وزارتِ خزانہ سنبھال چکے تھے وزیرِ اعظم بن گئے۔ سکندر مرزا ڈیفنس سیکرٹری اور ایوب خان کمانڈر انچیف کابینہ میں شامل ہو گئے۔ غلام محمد صاحب بیمار ہوئے تو ان کو قائدِ ذلت کا خطاب دیا گیا ان سے زبردستی استعفیٰ لیا گیا۔ اور اسکندر مرزا صاحب صدر بن بیٹھے۔ کنٹرولڈ ڈیماکریسی کا پرچار شروع ہو چکا تھا۔ یہ خیال اچھوتا اور قابلِ داد تھا۔ دنیا میں جمہوریت اس لیے ہوتی ہے کہ سرکاری ملازمین اور افواج قابو میں رہیں اور عوام کی خدمت کریں۔ کنٹرولڈ ڈیماکریسی کا کام یہ تھا کہ سرکاری ملازمین کے فیصلوں پر آمنّا و صدقنا کہے۔ اور ان کے فیصلوں کی تشہیر کرے۔

یہ سب کیونکر ممکن تھا۔ جواب آسان نہیں۔ قومی سطح پر سیاسی قیادت نہ ابھری اور نہ ابھر سکتی تھی۔ مسلم لیگ کا اتحاد ہندوؤں سے دشمنی کی بنا پر تھا۔ جب ہندو ہی نہ رہے تو اس میں اتحاد کہاں ممکن تھا۔ رائے عامہ مفقود تھی اور ملک کے مختلف حصّوں کے مقاصد اور مفاد میں ایسا اختلاف تھا کہ رائے عامہ متفق نہ ہو سکتی تھی۔ فوج اور انتظامیہ کا اتحاد آسان تھا۔ دونوں کے مقاصد ایک تھے۔ انھوں نے اتحاد کر کے ملک کو نئے راستے پر ڈالا۔

در ہر چمن کہ کردم بنیاد آشیاں را
افتاد صلح باہم گلچیں و باغباں را

به ملک ہستی مارو نہاد سلطانے
کہ ما بہ صلح دہیم او بہ جنگ می طلبد

کچھ احباب میرے گھر پر جمع تھے۔ سیاسی تذکرے ہو رہے تھے۔ دو تین دن پہلے مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں ایک قتل ہو چکا تھا۔ کسی نے کہا کہ دو تین دن سے فوجی نقل و حرکت ہو رہی ہے۔ نیا انقلاب آنے والا ہے۔ اتنے میں سڑک پر سے نعروں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ خان عبدالقیوم خان تشریف لائے ہیں۔ اور مسلم لیگ ان کا جلوس نکال رہی ہے۔ ہم سب باہر نکل کر تماشا دیکھنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے پولیس آگئی۔ اور آنسو گیس چھوڑی جانے لگی ہوا میرے مکان کی طرف آتی تھی۔ سارا گھر گیس سے بھر گیا۔ سب کی حالت خراب ہوئی۔ پانی سے بھگو کر کپڑے آنکھوں پر رکھے۔ لیکن گھنٹوں بے تابی میں گزرے۔ دوسرے ہی دن اسکندر مرزا صاحب نے مارشل لاء کا اعلان کر دیا۔ اور ایک نیا سیاسی دور شروع ہوا۔ ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ فوجی حکام نے حکم دیا کہ سڑکوں پر صفائی ہو۔ لوگ خود نکل کر صفائی کرنے لگے۔ حکم ہوا کہ قیمتیں کم ہوں۔ ہوئیں۔ لیکن خریداروں نے دوکانیں خالی کر دیں اور دکاندار دیوالیہ ہو گئے فوجی افسر خریداروں میں سرفہرست رہے۔ حکم ہوا کہ زرمبادلہ باہر سے لا کر سرکار کے حوالے کرو اور جمع کی ہوئی رقموں کا اعلان کرو۔ جن لوگوں کو پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ انھوں نے ساری تو نہیں۔ لیکن کچھ رقموں اور کچھ زرمبادلہ کا اعلان کیا باقی پی گئے

رشوت بند کرنے کا اعلان ہوا، لینے والوں نے شرح دوگنی کر دی اور رشوت کے مارشل لاء ریٹ چلنے لگے۔ دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ اب پکڑے جانے کا زیادہ ڈر ہے۔ فیصلہ ہوا کہ سارے راشی اور نااہل افسر نکالے جائیں گے کمیٹیاں بیٹھ گئیں۔ ہر شخص اپنے ماتحتوں کی چھان بین کرنے لگا۔ میرے محکمہ میں ایک افسر کی نااہلی اور بددیانتی اس قدر مُسلّم تھی کہ اگر کسی کو نکالا جاسکتا تھا تو اس کا نکلنا لازم تھا۔ صدارتی حکم صادر ہوا کہ یہ بنگالی ہے اس کو مت چھیڑو۔ بہت جلد اس کی ترقی کے احکام صادر ہُوتے۔ اپنی فکر میں کسی کو نیند نہ آتی تھی۔ کیونکہ یہ معلوم نہ تھا کہ اس چھان بین خود ہمارے ساتھ کیا ہونا ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ خُود دوسروں کو نکالنے کی سفارشات تیار کر رہا تھا اور اپنی خبر نہ تھی کہ کیا ہونا ہے۔ بہت سے افسر نکالے گئے۔ بیشتر سیاسی مصلحتوں کی بناء پر۔ خدا کا شکر ہے کہ میں بچ گیا۔ میرا کام ایسا تھا کہ حکومت کے لیے خطرناک ہونے کا سوال نہ تھا۔ لیکن دو عزیز بچپنے کے دوست سید فضل احمد کریم فضلی اور سید ابوطالب نقوی نکال باہر کیے گئے۔ دونوں قابلیت، جرأت اور انتظامی اہلیت کے لیے مشہور تھے۔ ان کا دائرہ اثر وسیع تھا۔ اس کو کیونکر برداشت کیا جاسکتا تھا۔ فضلی صاحب کا شعر ہے۔

جس خطا پر انھوں نے دی ہے سزا
وہ نہیں ہے میری خطا کچھ اور

اس میں شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ نقوی صاحب اس صدمے سے ایسے متاثر ہُوئے کہ دنیا چھوڑ کر پہاڑوں میں جا بیٹھے اور کچھ دنوں بعد دل کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ فضلی صاحب شاعر، مصنّف اور فلسفی تھے

انھوں نے پرواہ نہ کی اور فلم بنانے اور علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ دوسروں کا بھی حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجھ نااہل کو بھی ہرزہ سرائی پر آمادہ کر دیا۔ آخر فوجیوں کے رشوت مانگنے کی شکایتیں موصول ہونے لگیں۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ ان کو جلد واپس کیا جاتے۔ حکام اور ایوب خاں میں رشتے مستحکم ہو گتے تھے۔ اور انتظامیہ ایسے عناصر سے پاک ہو گئی تھی جن کی وفاداری پر شک کیا جا سکتا تھا۔ اب فوج کی فوری مدد کی ضرورت نہ تھی چند دن تو اسکندر مرزا برائے نام صدر رہے جب انھوں نے دیکھا کہ اقتدار بالکل ہاتھ سے نکل گیا اور مارشل لاء کے اعلان کا مقصد ہی فوت ہو چکا ہے تو نئی سازش کی کوشش کی۔ کامیاب نہ ہوئے اور ملک بدر کیے گئے۔ "چاہ کندہ را چاہ درپیش"۔ لندن چلے گئے اور وہاں عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن میں کبھی ان کے اعزاز میں چراغاں ہوا تھا۔ اسی عمارت کے سامنے گوشت اور ترکاری کا تھیلا لیے ہوئے گزرتے اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ مرے تو شہنشاہ ایران نے ان کی علالت کے اخراجات ادا کیے اور ایرانی حکومت کے خرچ سے ایران لاتے گئے اور وہیں دفن ہوئے۔

نام آج کوئی یاں لیتا نہیں ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا

اسکندر مرزا نکالے جا چکے تو ملک میں ترقی کے آثار نظر آنے لگے۔ غربا کچھ دن بہت خوش رہے۔ حکومت میں تبدیلیوں سے ملک تنگ آ چکا تھا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا اور مستحکم حکومت کا دور شروع ہوا۔

عہد ایوبی میں مجھ سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ شخصی حکومت کی اصلیت پر غور نہ

کیا۔ ایسی حکومت میں قاعدہ یا قانون کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حاکم کی خواہش ہی قانونِ وقت ہوتی ہے۔ میری تربیت انگریزوں کے عہد میں ہوئی تھی اس زمانے میں قانون کا احترام تھا کسی کی مرضی پر چلنا میرے ضمیر کے خلاف ہوتا۔ سب سے بڑی حماقت تو یہ تھی کہ ان کے صاحبزادے ایک فیکٹری جس کا معاہدہ جرمنی میں ایک کارخانے سے ریلوے کے لیے کیا گیا تھا خود لگانا چاہتے تھے اور ان کا مطالبہ تھا کہ معاہدہ میں ریلوے کا نام کاٹ کر ان کا نام لکھ دیا جائے۔ میں نے صاف انکار کیا۔ یہ انکار بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تجویزیں آئیں جن کو میں نے رد کر دیا۔ مجھ سے کہا جاتا کہ پریذیڈنٹ صاحب یہ کام کرانا چاہتے ہیں اس سے اختلاف نہ کرو۔ میں جواب دیتا پریذیڈنٹ صاحب حکم لکھ دیں کس کی مجال ہے کہ سرتابی کرے۔ لیکن مجھ سے رائے لی گئی تو میں اپنی رائے دوں گا۔ منظور ہو یا نہ ہو۔ باوجود میری ہٹ دھرمی کے میری رائے ہمیشہ تسلیم کی گئی۔ مجھے ستارۂ پاکستان سے نوازا گیا۔ زمین عنایت ہوئی اور آڈیٹر جنرل کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ ہرچند ان عنایتوں کے لیے میں شعیب صاحب وزیر خزانہ کا مرہونِ منت ہوں لیکن پریذیڈنٹ صاحب کی مرضی نہ ہوتی تو وہ کیا کر سکتے تھے۔

غایتِ ہمت ما وصل وے آمد جامی
ہمتے دار کہ کارے بہ کُند ہمتے ما

ہم ز کارم منع کردی ہم بکارم داشتی
اختیارم دادی و بے اختیارم داشتی

۱۹۶۲ء میں کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل آف پاکستان کے عہدے پر تعینات ہوا۔ یہ آئینی عہدہ ہے اور اس کے لیے قسم اٹھانی پڑتی ہے کہ میں بغیر خوف اور بغیر کسی کا لحاظ کیے اپنے فرائض انجام دوں گا۔ اور آئین کو برقرار رکھوں گا۔ مجھے تین مرتبہ قسم دی گئی۔ پہلی مرتبہ پرانے آئین کے مطابق دُوسری مرتبہ ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت۔ معلوم ہوا کہ اس دُوسری قسم میں آئینی سقم رہ گیا ہے۔ اس لیے تیسری مرتبہ پھر حلف دیا گیا

ہزار بار قسم خوردہ ام کہ نام ترا
نیاورم بہ لب اما قسم بہ جان تو بُود

مجھ سا ناسمجھ ڈھونڈنے پر مشکل سے ملے۔ میں سمجھا یہ بار بار قسمیں مجھ پر پابندیاں عائد کرتی ہیں۔ یہ بھول گیا کہ جس دن سے غلام محمد گورنر جنرل ہُوتے اس ملک کا آئین یہی ہو گیا کہ قسم کھاؤ اور بھول جاؤ۔ چنانچہ نہ کوئی پریذیڈنٹ، نہ کوئی کمانڈر انچیف، نہ کوئی دوسرا آئینی عہدہ دار قسموں کا پابند رہا۔ یہ وہ طبقہ ہے کہ اگر چاہے تو واقعی آئین کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ غریب آڈیٹر جنرل کیا کر سکتا ہے۔ لیکن میں قسم کا پاس رکھنا چاہتا تھا۔ نیا عہدہ سنبھالا تو معلوم ہوا کہ چھ سال سے حکومت کا کوئی حساب نہیں ہے۔ بجٹ پیش ہوتے تھے۔ اخراجات کھلے دل سے جاری تھے۔ لیکن آمدنی اور اخراجات

کے حساب کی کوئی ضرورت نہ سمجھی جاتی تھی۔ صاف کہا جاتا تھا کہ حساب رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مالی قانون کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ ان کو کھلے بندوں نظر انداز کیا جاتا تھا۔ میں نے حسابات تو مکمل کر دیئے۔ لیکن ساتھ ہی لکھنا پڑا کہ حکام متعلقہ کی بے اعتنائی کے سبب یہ حساب ناقابلِ اعتماد ہے۔ قانون کی پابندی کرانے کی کوشش کی تو سب کو مخالف پایا۔ پاکستان کا آڈیٹر جنرل اقوام متحدہ کے بورڈ آف آڈیٹرز کا رکن ہوا کرتا ہے۔ بعد میں میں بورڈ کا صدر بھی منتخب ہوا۔ مختلف ملکوں میں گیا اور اس امر کا مطالعہ کیا کہ وہاں مالی امور کی پابندی کیسے ہوتی ہے۔ یہاں کوشش کی کہ اس کا شائبہ پیدا کیا جائے۔ لیکن یہ پتھر کی دیوار سے سر پھوڑنے سے زیادہ مفید ثابت نہ ہوا۔ آئین کے مطابق سرکاری ملازمین کی تنخواہوں اور دوسری شرائط ملازمت کے قاعدے بنتے ہیں۔ قاعدوں کی پابندی پاکستان میں نہ ہوتی اور ہر افسر اپنی سی کرتا ہے۔ باز پرس کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اسمبلی یا تو ہوتی ہی نہ تھی یا اس کا عدم وجود برابر تھا۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا اجلاس شاذونادر ہی ہوتا۔ ہوتا بھی کیونکہ جب حسابات ہی موجود نہ تھے۔ اکثر یہ کمیٹی پنشن یافتہ افسروں کی ہوتی اور محض اشک شوئی کے لیے مقرر کی جاتی۔ اس کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ پھر بھی قاعدوں کی بنا پر اعتراضات تو ہو سکتے تھے۔ قوانین کی مسلسل خلاف ورزی کے خلاف میرے اعتراضات حکام بالا کے لیے سوہانِ رُوح تھے۔ انھوں نے نئی ترکیب سوچی۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بڑھائیں تو اس کے متعلق آئین کے تحت قاعدے بنانے سے انکار کر دیا۔ مصلحت یہ تھی کہ نہ قاعدے ہوں گے نہ اعتراض کی گنجائش نکلے گی۔ اس پر جھگڑا ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں نے اعلیٰ حکام کی تنخواہ

کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ مجھے سمجھایا گیا کہ یہ نادانی ہے۔ اس سے پریذیڈنٹ صاحب بہت ناراض ہیں۔ میں نے کہا میں قسم کھا چکا ہوں کہ بغیر کسی کی ناراضگی کی پرواہ کیے آئین کی بالادستی قائم رکھوں گا۔ یاد دلایا گیا کہ قسم سب کھاتے ہیں لیکن اس کی کون پروا کرتا ہے۔ پھر بھی عقل میں نہ آیا تو دھمکی دی گئی کہ تمھیں عدالت کے سامنے پیش کیا جائیگا۔ میں اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ اس سے پہلے بھی مجھے عدالت میں پیش کرنے کی تجویز پر اس لیے غور ہو چکا تھا کہ میں نے افسروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوتے ملکی حساب کا صحیح حال بیان کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ رخصت لی تو اخباروں میں چھپوا دیا گیا کہ نوکری سے نکال دیے گئے۔ آخر تنخواہوں کا جھگڑا یوں طے ہوا کہ سرکار نے وعدہ کیا کہ ضروری قاعدے جلد ہی شائع کیے جائیں گے اور میں نے تنخواہیں ادا کرنی شروع کر دیں۔ اسی نوع کا جھگڑا وزیروں کے سفر خرچ کے متعلق رہا۔ آئین کے مطابق اس کو اسمبلی سے قانون کی شکل میں پاس ہونا چاہیے تھا۔ اس کی بھی کسی کو پروا نہ تھی۔ میں مجبور تھا کہ جب تک اسمبلی قانون نہ پاس کرے میں ادا نہ کروں۔ یہ کوشش بھی عبث تھی۔ میری یہ ضد کہ حکومت آئین کی پابند رہے اور خود اپنے بنائے ہوتے قاعدوں اور قانون پر عمل کرے نہ پوری ہوئی نہ پوری ہونی تھی۔

میرا یہ قول کہ آنے دے قیامت ظالم
انکا یہ زور کہ دیکھوں مرا کیا ہوتا ہے

بالادستی افسروں اور حکومت ہی کی رہی۔ میرے پاس دلائل تھے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے پاس طاقت۔ دلیل اور طاقت پر ایک تاریخی

لطیفہ یاد آیا: جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے واجد علی شاہ کے اختیارات سلب کرنے کا فیصلہ کیا تو بادشاہ کے وکیل پرانے معاہدوں کو لے کر ریذیڈنٹ کے پاس گئے اور دلیلیں پیش کیں۔ ریذیڈنٹ صاحب بہادر نے تلوار بنیام سے نکال کر میز پر رکھ دی۔ اور کہا اس کا جواب لاؤ۔ غریب وکیل ایسی موثر دلیل کا جواب کہاں سے لاتا۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ اس کا جواب بکسر میں ختم ہو چکا۔ اسی طرح قانون کے احترام اور آڈیٹر جنرل کے فرائض کی انجام دہی کا خاتمہ تو غلام محمد صاحب لوزِ اول سے کر چکے تھے۔ اب سر پیٹنے سے کیا حاصل تھا۔ سوائے اس کے کہ اہلِ طاقت و اختیار سے دشمنی ہو جاتی۔

یار بگذشت از ہمہ خنداں واز من خشمناک
عمر بر من مشکل و بر دیگراں آسان گزشت

اس کی پروا نہیں۔ لیکن یہ ملال ضرور ہے کہ اس سے شعیب صاحب وزیر خزانہ کو تکلیف پہنچی۔ انھوں نے عمر بھر ایسی محبت کی اور ان کے اتنے احسانات ہیں کہ بھولنا ممکن نہیں۔ لیکن اللہ نے ایسی الٹی کھوپڑی دی ہے کہ نہ کبھی آئندہ کا خیال کیا نہ محبوں کا لحاظ۔ جو اصول سمجھا اس سے منحرف نہ ہو سکا۔ بہر صورت "تکبر" ہونے کے باوجود مجھے نوکری سے نکلوانے کی تجویزیں کامیاب نہ ہوئیں اور اختتامِ ملازمت پر عزت کے ساتھ پنشن پائی۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

بیا تا چہ داری تو از کار جنگ
کہ جستی بہ گیتی بسے نام و ننگ

دو عالمی جنگوں نے زندگی کی تشکیل کی۔ ان کے دور رس نتائج نے وہ ماحول پیدا کیا جس میں زندگی بسر ہوتی۔ ان ہی کے اثرات سے خیالات و عادات بدلتے رہے۔ ان کے اثرات سے معاشی، سماجی اور سیاسی تبدیلیاں دیکھیں۔ لیکن یہ دور دراز کے ملکوں کی جنگیں تھیں۔ ان کی خبریں انہماک سے پڑھتے۔ یہ تفریح کا ذریعہ تھیں۔ آخر اپنے ملک میں لڑائیاں دیکھیں۔ پہلی دو لڑائیاں تو دور رہیں لیکن تیسری اور چوتھی میں شہر پر گولہ باری اور آسمان سے بم گرتے دیکھے۔ اس کا اثر وہی جانتا ہے جس پر گزری ہو۔ بزرگوں کا قول ہے۔

"پادشاہاں بہ صحبت خردمنداں ازاں محتاج تر اند کہ خردمنداں بہ قربت پادشاہان۔"

ایوب خان کے پاس کسی صاف گو اور نیک صلاح دینے والے کا گزر نہ تھا انھوں نے اپنی مقبولیت بحال کرنے کی ہوس میں کشمیر پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں یہ تیاریاں دو مفروضوں پر مبنی تھیں۔ ایک تو یہ کہ کچھ آدمی اور تھوڑے سے ہتھیار بھیج دیے جائیں تو کشمیر میں عام بغاوت ہو جائے گی اور ہندوستانی فوج بھاگ کھڑی ہو گی دوسرا یہ کہ لڑائی کشمیر کے علاقہ تک محدود رہے گی اور ہندوستان کی ہمت نہ ہو گی کہ ہمیں کہیں اور چھیڑے۔ دونوں باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ کشمیریوں نے بغاوت نہ کی اور

ہندوستان نے دیکھا کہ کشمیر میں مؤثر دفاع ممکن نہیں تو لاہور اور سیالکوٹ پر حملہ کر دیا اس طرح تیسری جنگ ہُوئی۔

جس زمانے میں پاکستانی گوریلوں کی کشمیر میں داخلے کی خبر گرم تھی شعیب صاحب کے لڑکے کی شادی قرار پائی۔ میں بھی گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ہندوستانی فوج نے پیش قدمی کر کے حاجی پیر کا رستہ بند کر دیا ہے اور گوریلا فوج تباہ ہو رہی ہے۔ جواب میں پاکستانی فوج نے جموں کی طرف پیشقدمی شروع کر دی ہے اور کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ عام جنگ کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ لیکن فضا میں کشیدگی بہت تھی۔ واہ میں جنرل امراؤ خان نے کھانے کے لیے طلب کیا۔ یہ اس وقت ہتھیاروں کی فیکٹری کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ جنرل صاحب معذرت کر کے باہر چلے گئے۔ دو ایک منٹ میں بجلی غائب ہو گئی۔ جنرل صاحب موم بتیاں لے کر آئے اور فرمایا کہ مجھے فضائی حملہ کا اندیشہ تھا۔ اس کا امکان تو کم ہے۔ لیکن احتیاط ضروری ہے۔ دُوسرے دن تمام راولپنڈی میں بلیک آؤٹ رہا لیکن تیسرے دن شعیب صاحب کے گھر پر چراغاں ہوا۔ آئندہ صبح میں کراچی چلا گیا وہاں زندگی معمول پر تھی۔ ایک دن بعد دس بجے رسٹ ہاؤس میں کئی افسر ایک میٹنگ کے لیے جمع تھے۔ رسٹ ہاؤس کا ملازم گھبرایا ہوا آیا۔ ہاتھ میں ریڈیو تھا کہنے لگا کہ جنگ شرُوع ہو گئی ہے۔ پریذیڈنٹ صاحب تقریر کرنے والے ہیں خبر ہے کہ لاہور پر ہندوستان کا قبضہ ہو گیا ہے۔ میٹنگ وہیں ختم ہو گئی۔ سب نے صاحب صدر کی تقریر سُنی اور اپنا اپنا راستہ لیا۔ تقریر پر جوش تھی۔ اس سے خون گرم ہوا۔ دو بجے ہوائی جہاز سے مجھے واپس ہونا تھا۔ ٹیلیفون آیا کہ لاہور ہوائی جہاز

نہ جائے گا لیکن راولپنڈی کی سروس حسبِ دستور قائم ہے۔ اس سے پریشانی زیادہ ہوئی گھر ٹیلیفون کیا معلوم ہوا کہ وہاں خیریت ہے گو توپیں چل رہی ہیں۔ میں نے راولپنڈی جانے کے لیے جہاز میں جگہ مخصوص کرائی۔ اور راولپنڈی سے موٹر کا انتظام کیا تاکہ جلد سے جلد لاہور پہنچ سکوں۔ تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوا کہ راولپنڈی بھی جہاز نہ جائے گا۔ اب ریل کا خیال آیا۔ سید اقبال حسین پرانے دوست اور رفیق ڈویژنل ٹریفک افسر تھے۔ ان سے تیز گام میں جگہ کی درخواست کی۔ ان کے لہجے سے پریشانی اور جھنجلاہٹ عیاں تھی۔ جواب دیا کہ ساری ٹرین اب فوج کے تحت ہے اور کسی غیر فوجی کو اس میں جگہ نہیں مل سکتی۔ میں نے عرض کی کہ میں فوجی نہ سہی لیکن میری بھی ذمہ داریاں بڑی ہیں۔ فوجی کمانڈر سے بتایئے کہ میرا اپنے دفتر میں موجود ہونا ضروری ہے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے اطلاع دی کہ ان کی کوششوں سے ایک اپر برتھ مجھے مل گئی ہے۔ میں نے اس کو غنیمت سمجھا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ ہوائی حملہ کے خوف سے رات کو گاڑی میں مکمل اندھیرا کر دیا گیا۔ صبح گاڑی ملتان پہنچی تو اسٹیشن ماسٹر صاحب آئے اور کہا کہ آپ اُتر آئیں۔ آپ کے قیام کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ گاڑی کا اعتبار نہیں کہ کہاں تک جائے گی۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور جواب دیا کہ جہاں تک گاڑی جائے گی میں جاؤں گا۔ پھر اللہ مالک ہے۔ ساہیوال سے کھیتوں میں ٹینک اور فوجی گاڑیاں بھوسے سے ڈھکی ہوئی نظر آنی شروع ہوئیں۔ رائے ونڈ سے ایک ٹینک کا دستہ گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ دیہاتی ہزاروں کی تعداد میں سروں پر گٹھریاں رکھے بھاگ رہے تھے۔ بادشاہوں کے ذاتی حوصلے ہمیشہ غریبوں کی تباہی کا باعث ہوئے۔ اللہ اللہ کر کے لاہور آیا۔ اسٹیشن پر توپوں کی گرج سُنائی دی۔ پریشانی ہر طرف تھی۔ لیکن

گھر میں سب کو خیریت سے پایا۔ دفتر میں بھی کام حسب معمول جاری تھا۔ آئندہ سولہ دن توپیں گرجتی رہیں اور در و دیوار ہلتے رہے گو طرح طرح کی خبریں زبان زد عوام تھیں۔ شہر کا نظم و نسق قابل داد رہا اور عوام نے جوش، ہمت اور قربانی کا وہ مظاہرہ کیا جس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے۔ آخر معلوم ہوا کہ لڑائی بند ہو گئی اور سب نے اطمینان کا سانس لیا پھر بھی کئی ہفتوں تک کبھی کبھی توپوں کے گرجنے کی آواز آتی رہی۔

ایک دن اعلان ہوا کہ چھاتہ بردار ہندوستانی فوج اترنے والی ہے۔ سب اپنے ہتھیار سنبھالیں اور ہوشیار رہیں۔ رات کو دس بجے رائفل چلنے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ دو طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہماری ہی سڑک پر لڑائی ہو رہی ہے۔ ہتھیاروں میں میرے پاس صرف ایک پستول ہے۔ جو کسی زمانے میں خریدا تھا۔ لیکن اس کو آج تک چلانے کی نوبت نہیں آئی۔ پستول بھرا اور باہر نکلا سڑک پر مجمع تھا۔ کسی کے پاس ڈنڈا کوئی کلہاڑی لیے ہوئے اور کوئی لوہے کی سلاخ سے مسلح۔ مجھے دیکھ کر سب نے گھیر لیا اور گھر جانے پر مجبور کیا۔ میں نے کہا کہ خطرے کا وقت ہے۔ تمہارے پاس سوائے ڈنڈے کے کچھ نہیں۔ میرے پاس کم سے کم پستول تو ہے جواب ملا کہ ہماری زندگی کس مصرف کی ہے۔ اگر ہم مر بھی گئے تو ملک کا نقصان نہ ہوگا۔ آپ کے سپرد ملک کے اہم کام ہیں۔ اگر آپ کو خراش بھی لگ گئی تو اس نازک وقت میں ملک کے کاروبار میں فرق آئیگا۔ آپ کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ گھر بیٹھیں اور ہمیں اپنی ذمہ داری پوری کرنے دیں۔ میں لاکھ اصرار کرتا رہا۔ لیکن مجمع نے مجھے زبردستی اندر کر کے پھاٹک بند کر دیا۔ ان کی باتوں سے آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ یہ ان لوگوں کی حب الوطنی کی ادنیٰ مثال

تھی جو دن بھر مزدوری کر کے پیٹ پالتے اور رات بھر مُفت میں ریل سے ہتھیار اتارنے میں مصروف رہتے۔ تاکہ فوج اس زحمت سے بچی رہے۔ بعد میں لطیفہ معلُوم ہُوا کہ یہ گولیاں پولیس کی دو چوکیوں کے درمیان چل رہی تھیں۔ اتفاق سے ایک بندوق کے درغ جانے سے خیال پیدا ہوا کہ وہاں چھاتہ بردار فوج ہے اور باقاعدہ لڑائی شرُوع ہوگئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس غلط فہمی میں نہ تو کوئی ہلاک ہُوا نہ زخمی۔

لڑائی ختم ہوتے ہی امریکہ جانا ہوا۔ وہاں کے اخبارات مختلف جگھوں پر لڑائیوں کے حالات سے بھرے پڑے تھے۔ ان سے اندازہ ہوا کہ کس طرح سپاہیوں اور نوجوان افسروں نے جانیں دے کر ہندوستانی حملہ روکا۔ کس طرح فتح کے مواقع گنوائے گئے۔ اور کس طرح صدر ایوب بار بار صدر جانسن کو ٹیلیفون کرتے رہے کہ لڑائی رکوائی جائے۔ امریکہ نے لڑائی تو رکوا دی لیکن ہم کشمیر فتح کرنے کا عزم پُورا نہ کر سکے۔ مفت میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور تباہی پھیلی۔ لڑائی رکنے کے کافی عرصے کے بعد رُوس نے صلح کرانے کی کوشش کی۔ اور معاہدہ تاشقند پر دستخط ہوئے اس معاہدہ کے تحت لاہور اور سیالکوٹ کے مضافات سے ہندوستانی فوجیں واپس ہوئیں اور ہم نے راجستھان اور مشرقی پنجاب کے مقبوضہ علاقے واپس کیے۔ فوجیں مورچوں سے ہٹ کر اپنے ٹھکانوں پر واپس ہوئیں۔ قیدی واپس لوٹے مگر ملک میں یہ معاہدہ اس قدر نامقبول ہُوا کہ ہر طرف ہنگامے شرُوع ہو گئے اور اس وقت تک جاری رہے جب تک ایوّب خان اپنے اختیارات چھوڑ کر گوشہ نشین نہ ہو گئے۔

اختیارات چھوڑنے سے پہلے صدر ایوب خاں نے انتہائی کوشش کی کہ کوئی ایسا حل نکل آئے کہ اختیارات سیاسی رہنماؤں کو منتقل ہو سکیں۔ کچھ اہل سیاست کے آپس کے اختلافات اور کچھ فوج کی دھمکی۔ یہ ممکن نہ ہوا مجبوراً مارشل لاء کا اعلان ہُوا اور اختیارات یحییٰ خاں نے سنبھالے۔ انھوں نے جمہوریت بحال کرنے کا اعلان کیا۔ سیاسی سرگرمی شروع ہوئی تو کوئی مقرر بغیر غلام محمد، اسکندر مرزا اور ایوب خان کو گالیاں دیئے تقریر کر ہی نہ سکتا تھا۔ حالات کچھ ایسے بگڑے کہ پہلے مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی شروع ہُوئی۔ اس دور میں وہ واقعات رونما ہُوئے کہ غیرت مندوں کو اپنے کو پاکستانی کہتے شرم آنے لگی۔ پھر ہندوستان سے لڑائی ہو گئی۔ چودہ دن تک توپوں کی گرج سنتا رہا اور سر پر دشمنوں کے ہوائی جہاز اڑتے دیکھتا رہا۔ سامنے بم گرتے دیکھے۔ آخر شکست تسلیم کرنی پڑی اور یحییٰ خان کی بھی حکومت ختم ہو گئی۔

خوف اور نفرت کی بناء پر حکومت بنتے دیکھی۔ خوف اور نفرت سے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ جنگ کے شوق اور جنگی تیاریوں سے ملک کی معاشی تباہی دیکھی۔ مسلمانان ہند کی یگانگت اور یکجہتی کو تباہ ہوتے دیکھا۔ تین گروہوں میں تقسیم ہو کر ان کی ذلّت ورسوائی دیکھی۔ تینوں میں ان کی بڑھتی ہوئی غربت اور نا امیدی دیکھی۔ ابھی دیکھیے قسمت کا لکھا کیا دیکھنا باقی ہے۔

چار آمروں کی حکومت دیکھی۔ ان کا جاہ وجلال اور دبدبہ دیکھا۔ پھر ان کی ذلّت اور رسوائی دیکھی۔

فلک راندانم چہ دارد گمان
کہ ندہد کسے را بجان خود امان
کسے را اگر سالہا پرورد
درو جز بخوبی دمے نہ نگرد
چو این کند مرد را یک زمان
ازاں پس بنا بد بر او بے گمان
ز تخت اندر آرد نشاند بہ خاک
ازیں کار نے ترس دارد نہ باک
ز مہرش مدار اے برادر امید
اگرچہ دہد بے کرانت نوید

یاد آں گلشن کہ گُل ہر چند می چیدم ازاں
وقت بیرون آمدن حسرت بہ داماں داشتم

سرکاری ملازمت پلک جھپکتے گزر گئی۔ چناں گزشت کہ گوئی مگر بخواب گزشت۔

ذوقِ اسیری سے دل نہ بھرا تھا۔ ایک صنعت کار نے اچھے مشاہرے پر ملازمت کی پیش کش کی۔ اسے غرور کہیے یا غیرت۔ طبیعت نے قبول نہ کیا کہ جو شخص کل سرکاری کرسی کی بدولت عزت سے ملتا تھا آج اس کی ملازمت کروں۔

لب تشنہ رفت و دامن پرہیز تر نہ کرد
زاں چشمہ کہ خضر و سکندر وضو کنند

عمر بھر کے مشاغل چھوٹنے اور پرانے رفیقوں سے علیحدگی کے خیال سے طبیعت پر افسردگی طاری تھی۔ کئی رخصتی دعوتیں ہوئیں۔ پرانے رفیقوں نے عزت افزائی اور محبت کے الفاظ میں الوداعی تقریروں سے نوازا۔ اقوامِ متحدہ کے بورڈ آف آڈیٹرز نے چاندی کا سگریٹ کیس تحفۃً دیا۔ سیکرٹری جنرل یوتھانٹ نے رخصتی لنچ پر بلایا۔ تعریفی الفاظ سے نوازا اور کہا کہ تمھارا تعلق اس ادارے سے منقطع نہ ہونے پائے گا۔ یہ وعدہ شرمندۂ وفا نہ ہوا۔ خود میری حکومت مجھ سے ناراض تھی وہ کیا کر سکتے تھے۔

ریلوے اکاؤنٹس سروس نے اپنے ایڈریس میں جو باتیں کہیں ان کا دل پر آج تک اثر ہے۔ من آنم کہ من دانم۔ پھر بھی اب ان لوگوں کو مجھ سے کوئی غرض باقی نہ تھی ایسا اظہارِ محبت کیونکر بھولے۔ انھوں نے چاندی کا ایک تھال اور قرآن پاک کا ایک

نسخہ بھی دیا۔ یہ میری عزیز ترین ملکیت ہیں۔ ان سے محبت کی بُو آتی ہے اور رفیقوں کی یادیں وابستہ ہیں۔

ملازمت کی ابتدا حقیر تھی۔ انتہا کسی قدر مقتدر۔ سود و زیاں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس سے معاش حاصل ہُوئی۔ ہم چشموں میں عزت بڑھی۔ کچھ مشکل کام کیے بعض ایسی گتھیاں سلجھائیں جو دوسروں سے نہ سلجھ سکی تھیں۔ اس لیے ملک و قوم کی خدمت کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔ لیکن گھر سے بار بار اور طویل غیر حاضری سے بچوں کی تربیت پر توجہ نہ ہو سکی۔ خود اپنی افتادِ طبیعت پر جو اثر پڑا انتہائی غم ناک تھا۔ نخوت مزاج میں داخل ہو گئی۔ حکومت اور خوشامد پسندی کی عادت ہو گئی۔ جو اختیارات ملک کی خدمت کے لیے عاریتاً تفویض ہُوئے تھے ان کو اپنا ذاتی حق سمجھنے لگا۔ غرور اور احساسِ برتری نے اپنوں سے دور کر دیا۔ انگریزی اثرات نے لباس، گفتار اور طرزِ خیال بدل دیا اس سے وطن ہی میں بے گانہ ہو گیا۔ حقوق العباد پورا کرنے کی فکر میں حقوق اللہ سے غافل رہا۔ گو ملازمت سے علیحدہ ہو چکا اور انگریزوں کی غلامی عرصہ ہوا ختم ہو چکی۔ لیکن مزاج سے ان اثرات کا مٹانا اور ان عادتوں کا بدلنا آسان نہیں۔ اس امید میں جیتا ہوں کہ اللہ بڑا رحم کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔

اب بغیر محنت کیے کھانے کو ملتا ہے۔ لیکن مدتوں کی غلامی اور جفاکشی کے بعد طبیعت بے کاری سے گھبراتی ہے۔ احباب سے تذکرہ کیا تو مشورہ ملا کہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کرو۔ دل میں آیا۔

مرا گویند بے دردان کہ دستے زن بہ دامانش
اگر می داشتم دستے گریبان پارہ می کردم

اسی کی قابلیت ہوتی تو بغیر مشورہ کے کب کا کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا۔ اخبارات میں کچھ انگریزی مضامین شائع کیے۔ بے مقصد اور بے اثر۔ پہلی مرتبہ اردو میں قلم اٹھانے کی جرآت کر رہا ہوں۔

بعض دوستوں کے اصرار پر سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی لیکن جلد ہی کنارہ کش ہو گیا۔ اس کی تفصیل پاکستانی سیاست اور اہلِ سیاست پر تبصرہ کیے بغیر ممکن نہیں اور اس شغل سے علیحدگی کے بعد یہ مناسب نہیں۔

زاہدم برد بہ مسجد کہ مرا توبہ دہد
توبہ کردم کہ نہ فہمیدہ بجائے نہ ردم

پینسٹھ سال کا ہو چکا گو ابھی ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ امنگیں، ولولے، امیدیں اور حوصلے خواب بے تعبیر ہو چکے ہیں۔ دنیا کی کش مکش، ناکامیوں اور مسرتوں سے دن بدن بے تعلقی بڑھتی جاتی ہے۔

مرا در نوجوانی آرزو ہا بود چوں صد بر
بہ پیری چوں رسیدم ترک آز و آرزو کردم

اب دعا کیجیے کہ مرگ ناگہانی نصیب ہو اور باپ کی طرح سالوں بستر پر ایڑیاں رگڑ کر نہ مروں۔

میں نے ہوش سنبھالا تو قوم نے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی ٹھانی تھی۔ وہ عزم مکمل کیا۔ لیکن یہ شکست فاتحانہ تھی۔ آزادی سے جو امیدیں وابستہ تھیں ان کو اپنے ہاتھوں تباہ ہوتے دیکھا۔ ہمارا زمانہ گزر چکا۔ نئی نسل کی نئی ضروریات ہیں۔ نئے عزم ہیں۔ نئے حوصلے ہیں۔ یہ بھی اپنے حوصلے پورے کریگی، ساتھ

ہی نئی غلطیاں کرے گی۔ جو زندہ ہوگا دیکھے گا۔ بے بس اور بے گناہ برباد ہوں گے۔
موقع پرست فائدہ اٹھائیں گے۔ اہلِ نظر آنسو بہائیں گے۔

دنیا یوں ہی ناشادیوں میں شاد رہے گی
برباد کیے جاتے گی آباد رہے گی

لاہور، ۳۱۔ دسمبر ۱۹۷۱ء

مشتاق احمد

ایں است بیادم کہ دریں عمر سبک سیر
چیزے کہ ازاں یاد تواں کرد ندیدیم

گفتیم سخنہا و شنیدیم سخنہا
اما بہ کہ گوئیم چہ گفتیم و شنیدیم

چوں مردمک دیدہ دریں خانۂ دل تنگ
بسیار دویدیم و بجائے نہ رسیدیم